روشنی میں ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان کو قتل کرنے کی مذمت و شناعت بیان کی گئی ہے، اس سلسلہ میں قتل کی مختلف نوعیتوں کو بیان کرکے شریعت محمدی میں مذکور، ان کی اخروی و دنیوی سزاؤں کی تفصیل قلمبند کی ہے، موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں باہم قتل و خون ریزی بہت عام ہے، یہ کتاب اسی دردناک صورت حال سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے، خدا کرے یہ دردمندانہ تحریر مسلم معاشرہ کی اصلاح کا باعث بنے۔

ایک معلم کی ڈائری :- مرتبہ جناب بشر علی صدیقی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۲۰، قیمت ۱۵ روپے۔ پتہ سکریٹری سلیم بشر اردو سوسائٹی، گلی وحید بخش، محلہ سوتھا، بدایوں۔

جناب بشر علی صدیقی بڑھاپے اور معذوری کے باوجود نوجوانوں سے زیادہ محنت، شوق اور جوش و ولولہ سے کام کر رہے ہیں، معلمی کے پیشہ سے نیک نامی کے ساتھ سبکدوش ہونے کے بعد وہ اردو کی خدمت، مادری زبان میں تعلیم کو فروغ دینے، مفید مضامین اور کارآمد کتابوں کی تالیف و تصنیف میں سرگرمی و جانفشانی سے لگے ہوئے ہیں، اس وقت وہ اپنی ڈائری مرتب کر رہے ہیں، جس کا یہ آخری حصہ چھپا ہے، جو ایک ماہ سے بھی کم عرصہ یعنی ۲۵ مئی تا ۲۳ جون ۱۹۸۶ء کا روزنامچہ ہے، وہ جن کتابوں، رسالوں اور ان کے خاص نمبروں کا مطالعہ کرتے رہے ہیں، اس میں ان کے مندرجات کے خوب و ناخوب کا ماہرانہ جائزہ لیا ہے، اس کے علاوہ، اردو کی خدمت اور اس کی تعلیم کے فروغ کے جس کام کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کی ہے اسکی اہمیت اور مشکلات بتائی ہیں اور اگر کسی علمی و تعلیمی شخص سے ان کی ملاقات اور ضروری گفتگو ہوئی ہو، تو اسکو بھی پیش کیا ہے، اس حیثیت سے اس ڈائری کی نوعیت دوسری ڈائریوں سے مختلف ہے، اور اس میں علمی تعلیمی اور تہذیبی مسائل زیر بحث آئے ہیں، جو دراصل ایک معلم کے مطالعہ و تجربہ کا نچوڑ ہیں۔

"ض"

جلد ۱۴۰ ماہ صفر المظفر ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۷ء عدد ۴

مضامین

مقالات

شذرات

ہمارے ملک کو آزادی حاصل کیے ہوئے چالیس برس ہو گئے، اس مدت میں یہ شاہراہِ ترقی پر کتنا گامزن ہوا، وہ آج کل تقریروں اور تحریروں کا موضوع بنا ہوا ہے۔

موجودہ دنیا میں سائنس اور ٹکنالوجی کو اتنا فروغ ہو چکا ہے کہ اب ترقی خود ہی انسانی زندگی اور تمدن کے قراول اور ہراول کا کام دے رہی ہے، ہمارا ملک بھی اس سے کیوں فائدے نہ اٹھاتا، یہ اپنی صنعت و حرفت کی کارگزاریوں کی بدولت جنگی اسلحہ اور لڑاکا ہوائی جہاز بھی تیار کرنے لگا ہے، تیز رفتار ریلوے انجن بھی بن رہے ہیں، ریل کی پٹریوں کا جال ہر طرف بچھ گیا ہے، سبک رو ریل گاڑیاں ملک کے کونے کونے تک پہونچ رہی ہیں، ریل کے ڈبوں میں راحت اور آسایش کا اتنا سامان بہم ہو گیا ہے کہ غریب اور امیر دونوں مسافر دن کے بجائے رات ہی کو آرام سے سوتے ہوئے سفر کرنا پسند کرتے ہیں، نئی نئی سڑکوں کی تعمیر سے بسیں، ٹیکسیاں اور نجی کاریں دور دراز علاقوں تک بل کھاتی اور لہراتی ہوئی مسافت طے کرتی دکھائی دیتی ہیں، ہوائی جہاز کی آمد و رفت کی سہولتوں کی وجہ سے دنیا سمٹ کر اس کی آغوش میں آگئی ہے، زراعت کی آبپاشی کے لیے بھاکرا ننگل ڈیم اور دامودر ویلی اسکیم کی تکمیل کر کے انجینیرنگ کا کمال دکھا دیا گیا ہے، کھیتوں میں بجلی کے ذریعے پانی پہونچنے اور کھاد کے فراہم ہو جانے سے کئی کئی فصلیں ہونے لگی ہیں، غلہ میں خود کفیل ہو کر یہ دوسرے ملکوں کو بھی برآمد کرنے لگا ہے، دواسازی کے کارخانوں کی کمی نہیں، اسپتالوں کا اضافہ پہلے سے بہت زیادہ ہو گیا ہے، روزمرہ استعمال کی جتنی چیزیں ہیں، اس کے اندر ہی بننے لگی ہیں، ان کی درآمد باہر سے بالکل نہیں ہوتی، کپڑے، سیمنٹ، لوہے، پٹ سن، شکر، ٹیلیفون، جہاز سازی، شیشے اور چینی کے برتن وغیرہ کی فیکٹریوں کی پیداوار خاطر خواہ ہوتی رہتی ہے۔ اب تو ہمارا ملک ایٹمی دوڑ میں داخل ہو گیا ہے،

خواندگی کی شرح بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے، گاؤں گاؤں پرائمری اور مڈل اسکول کھل گئے ہیں، ہر ضلع میں ہائی اسکولوں کی بہتات ہے، جس ضلع میں پہلے ایک ڈگری کالج بھی نہ تھا، وہاں اب ڈیڑھ درجن تک دیکھے جا سکتے ہیں، ان میں ہر طرح کے شعبے کھول دیے گئے ہیں، ہر ریاست میں طرح طرح کی یونیورسٹیوں کی فراوانی ہے، طلبہ کو حصول تعلیم کے لیے تمام ممکن صورتیں فراہم کر دی گئی ہیں، پہلے کی بڑی بڑی تنخواہوں کے برابر بعض طلبہ کو وظائف دیے جاتے ہیں، ان کو بیرونی تعلیم کے لیے ہر قسم کی سہولتیں میسر ہیں، تعلیمی اداروں کے اساتذہ کو وہی تنخواہیں مل رہی ہیں جو برطانوی حکومت کے بڑے بڑے عہدیداروں کو دی جاتی تھیں۔

ملک کی مالی اور اقتصادی حالت کو سنوارنے اور استوار کرنے کے لیے بینک کی شاخیں گاؤں گاؤں تک

پھیلا دی گئی ہیں، چھوٹے بڑے تاجر اور صنعت کار ان سے ہر طرح کے فائدے اٹھا رہے ہیں، کسانوں اور مزدوروں کو ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے آسان شرطوں پر قرض دیے جاتے ہیں، حکومت کی مالی ساکھ کی وجہ سے عالمی بینک اور انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ سے زیادہ سے زیادہ قرض مل رہے ہیں جو ملک کے مختلف فلاحی کاموں میں برابر صرف کیے جا رہے ہیں، بین الاقوامی محاذ پر بھی اس ملک کا وقار بڑھا ہے، روس اور امریکہ اپنی حکمت عملی سے ہر ملک کیا بلکہ دنیا کی سیاست کے رخ کو بدل دینے کی فکر میں رہتے ہیں، روس کو شروع ہی سے یہ خیال رہا ہے کہ بین الاقوامی سیاست میں اس کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ اس ملک کا وفادار دوست بنا رہے، یہ بات امریکہ کو برابر کھٹکتی رہتی ہے، اس لیے وہ بھی اس کی مزاج داری کے لیے کوشاں رہتا ہے، اور جب سے اس کو غیر جانب دار ملکوں کی سربراہی حاصل ہو گئی ہے، اس کی بین الاقوامی عزت میں اور بھی اضافہ ہوا ہے، دولت مشترکہ میں اس کا وزن اتنا بڑھ گیا ہے کہ ضرورت کے وقت برطانیہ سے ٹکر بھی لے سکتا ہے۔

ملک کے اندر گرانی ضرور بڑھتی جا رہی ہے، مگر اس کی قوت خرید سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب یہاں غریبی دم توڑ رہی ہے، کسی چیز کی قیمت خواہ کتنی ہی بڑھ جائے، اس کی خریداری میں کمی نہیں ہوتی، ہر دوکان پر خریداروں کی کثرت سے بڑی رونق رہتی ہے، کپڑوں کے تاجروں کو شکایت ہے کہ سستے اور موٹے جھوٹے کپڑے اب کوئی نہیں خریدتا، زیادہ تر اچھے کپڑے گراں قیمت پر خریدے جاتے ہیں، مردوں اور عورتوں کے جسم پر بیش قیمت کپڑے ہی دیکھنے میں آتے ہیں، جو پہن کر گرانی کی شکایت بھی کرتے ہیں، ریل کے کرایے بڑھنے پر ہر طرف چیخ پکار ہوتی ہے، مگر ریل پر سفر کرنے والوں کا ہجوم برابر بڑھتا ہی جاتا ہے، کرایے کی زیادتی سے سفر کرنے والوں کی بھیڑ میں کمی نظر نہیں آتی، مٹھائی کھانا لازمی ضروریات زندگی میں سے نہیں لیکن گراں سے گراں مٹھائیاں بعض اوقات اتنی جلد ختم ہو جاتی ہیں کہ پھر ان کا ملنا آسان نہیں ہوتا، ملک میں بہت سی خرابیاں بھی ضرور ہیں، لیکن اتنی بڑی آبادی میں صرف اچھائی کی توقع کرنا انسانی اور معاشرتی تقاضوں سے بے خبر رہنا ہے۔

البتہ دو باتیں ایسی ہیں جو ضرور توجہ طلب ہیں، علاقائیت کا تعصب پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے، جب تک کانگریس ہر ریاست میں حاوی رہی پورا ملک قومیت کے موتیوں کا ایک ہار نظر آتا تھا، اب بڑھتی ہوئی علاقائیت کی وجہ سے اس ہار کے موتی بکھرتے نظر آ رہے ہیں، پنڈت جواہر لال نہرو یہاں کے لوگوں میں بین الاقوامی ذہن پیدا کرنا چاہتے تھے، مگر ان کو اپنی زندگی میں اعتراف کرنا پڑا تھا کہ یہاں کے باشندوں کا ذہن بین الاقوامیت سے ہٹ کر قومیت پر بھی نہ رک سکا، بلکہ وہ صوبائیت سے بھی نیچے گر کر چھوٹے بڑے علاقے کی علاقائیت پر آ کر سمٹ گیا ہے، یہ ملک کی سالمیت کے لیے بہت بڑا خطرہ بنتا جا رہا ہے۔

اسی لیے جذباتی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور وطن دوستی کا جو نعرہ بلند کیا گیا تھا، وہ اب بانگِ درا کے بجائے

بانگ بے محل ہوتا جارہا ہے، حوصلہ فرسا، خون ریز اور تباہ کن فرقہ وارانہ فسادات کی شرح روز بروز بڑھتی جا رہی
ہے، خود حکومت کی سرکاری رپورٹ ہے کہ کبھی کبھی تو سال کے تین سو پینسٹھ دن میں چار سو چونسٹھ
فسادات ہوتے ہیں، یہ زیادہ تر ہندو مسلمان کے درمیان ہوتے رہتے ہیں، ایک عام مسلمان ان فسادات
سے اب زیادہ نہیں گھبراتا ہے، وہ سمجھنے لگا ہے کہ کائنات کے عناصر اربعہ کی طرح وطن کے بہت سے عناصر میں
ایک عنصر بلوہ فساد بھی سہی، اس سرزمین کے سانپ اور بچھو کی طرح یہ بلوائی اور فسادی بھی ہیں، جس طرح یہاں
کے سانپ اور بچھو ان کی روزمرہ زندگی کو ختم نہیں کر سکتے، اسی طرح یہ دشمن وطن ان کی اجتماعی حیات کو
برباد نہیں کر سکتے۔

مگر تمام مسلمان اس اعصابی جنگ سے ضرور سراسیمہ اور پریشان ہیں، جو ان کو صحافت کی جادو نگاریوں، سیاسی
لیڈروں کی شیوہ بیانیوں، وطنیت اور قومیت کے خود ساختہ جارحانہ نظریوں، سرکاری حکام کی خاموش نگاہوں
اور پولیس کی ستم آرائیوں کے ذریعہ سے یہ احساس دلایا جا رہا ہے کہ وہ یہ سمجھیں کہ یہ ملک صرف ہندوؤں
کا ہے، یہاں ان ہی کا مذہب ہوگا، ان ہی کا مندر ہوگا، ان ہی کا طرز زندگی ہوگا، ان ہی کا کلچر ہوگا، سیکولرزم کے
نام کی آڑ میں ان ہی کا تصور ریاست ہوگا، اور ان ہی کا ملکی قانون ہوگا، جو شہری شعوری اور غیر شعوری طور پر
اس کو تسلیم نہیں کرتے ان کو یہاں رہنے کا حق نہیں، اگر کسی سیاسی رہنما کی مصلحت کوشی اور شیریں بیانی، یا کسی
اخبار کے کالم نگار کے قلم کی زور آوری اور مغالطہ آمیزی یا جلسے جلوس کے ہجوم کی ہنگامہ آرائی اور نعرہ بازی سے
یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جائے کہ مسلمانوں کا یہ احساس فرضی اور غیر حقیقی ہے تو فرض ناشناس بن کر ایک حقیقت
پر پردہ ڈال کر اور ملک کے جسم کے ناسور کو ناسور نہ سمجھ کر وطن دوستی کے بجائے وطن دشمنی کا ثبوت دینا ہے، یہاں
ملک کے ماضی کی تاریخ بڑی لمبی ہے، گذشتہ دور میں کوتاہ نظری، کج فہمی اور عدم رواداری کی بے خبری
اور ناعاقبت اندیشی سے اس کو جو نقصانات پہونچتے رہے ہیں، ان کا کھلے ذہن کے ساتھ برابر
تجزیہ کرتے رہنے ہی میں ملک کی اصلی ہوا خواہی، دوستی اور محبت ہے، یہاں کی ایک بہت بڑی آبادی
کو یہ کہنے پر مجبور کرنا سچی وطنیت اور اصلی قومیت کا شعار نہیں:

ع۔ نمک پاش، خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

مقالات

سیرت نبوی اور مستشرقین،
منٹگمری واٹ کے افکار کا تنقیدی جائزہ

از۔ ڈاکٹر عماد الدین خلیل،

المعهد الحضاری، الموصل، عراق

ترجمہ:۔ عبید اللہ کوٹی ندوی، رفیق دار المصنفین۔

(۳)

ورقہ سے استفادہ اور آیندہ اسلامی تعلیمات میں اس کے افکار سے اثر پذیری کا ہم
بعد میں جائزہ لیں گے، البتہ اس موقع پر ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ وحی کے ابتدائی لمحوں
کے متعلق واٹ کی طرف سے شک پیدا کرنے کی پیہم کوششوں کی طرف بھی اشارہ کردیں،
وحی کا ابتدائی واقعہ بالکل واضح ہے، اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیان کے
مطابق درج ذیل معروف طریقہ سے پیش آیا وہ فرماتی ہیں کہ:۔

(اس زمانہ میں) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آبادی سے باہر رہنا پسند تھا چنانچہ
غار حرا میں تنہا رہتے، اور وہیں کئی کئی رات) عبادت کرتے اور اس کے لیے اپنا توشہ
ساتھ رکھتے، ختم ہو جاتا تو حضرت خدیجہؓ کے پاس آکر پھر توشہ ساتھ لیجاتے یہاں تک
کہ وہ غار حرا ہی میں تھے، کہ حق کی آمد ہوئی، فرشتہ آپؐ کے پاس آیا، اور اس نے کہا۔

پڑھ ! فرمایا میں ان پڑھ ہوں، فرمایا کہ اس فرشتہ نے مجھے پکڑا اور زور سے بھینچا جس سے میں تھک گیا، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا، اور کہا پڑھ ! تو میں نے پھر کہا کہ میں ان پڑھ ہوں، اس نے مجھے پکڑ لیا، اور تیسری بار بھی مجھے زور سے دبایا اور چھوڑ دیا پھر اس نے کہا کہ پڑھ اپنے رب کا نام، جس نے پیدا کیا، انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ اور تیرا رب بڑا مہربان ہے، جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، اس واقعہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے، تو آپ دل دھڑک رہا تھا، حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچے تو فرمایا۔ مجھے اڑھا دو، مجھے اڑھا دو لوگوں نے آپ کو اڑھا دیا، تو خوف جاتا رہا، پھر آپ نے حضرت خدیجہؓ سے پورا واقعہ بتایا اور فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہے تو حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ ہرگز نہیں، اللہ کی قسم ! اللہ آپ کو کبھی بے سہارا نہیں چھوڑے گا، آپ رشتہ جوڑتے ہیں (دوسروں کا) بوجھ اٹھاتے ہیں، مفلس کو دیتے ہیں، مہمان کی ضیافت کرتے اور حق پر آئی ہوئی مصیبتوں میں (دوسروں کی) مدد کرتے ہیں، پھر خدیجہؓ آپ کو لیکر اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزی کے پاس گئیں، وہ دور جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے، اور انجیل سے عبرانی تحریر میں جس قدر ہو سکتا لکھ لیا کرتے تھے، بوڑھے اور آنکھوں سے معذور ہو چکے تھے، خدیجہؓ نے کہا اے برادر عم زاد ! اپنے بھتیجے کی بات سن لیجئے تو ورقہ نے آپ سے کہا کہ اے بھتیجے، کیا بات ہے ؟ آپ نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ ان کو بتلایا، تو ورقہ نے کہا کہ یہ تو وہ ناموس (روح مقدس یعنی حضرت جبرئیل) ہے جس کو اللہ نے حضرت موسیٰؑ کے پاس بھیجا تھا، کاش میں اس وقت تک جوان رہتا، کاش میں زندہ رہتا، جب کہ آپ کو آپ کی قوم نکال دیگی، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے ؟ ورقہ نے کہا کہ ہاں ! جس آدمی نے بھی وہ چیز پیش کی جو تم لائے ہو اس کو اذیت ہی دی گئی ہے، تمہارا وہ دن اگر مجھے ملا تو میں پوری طرح تمہاری مدد کروں گا، اس کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں ورقہ کا انتقال ہو گیا، اور وحی کچھ دنوں تک نازل نہیں ہوئی۔[1]

واٹ نے گذشتہ وحی کا جو ذکر کیا ہے، مذکورہ تفصیلات میں اس کا وجود کہاں ہے ؟ پھر ورقہ کے ساتھ سابق میں اور اس کے بعد مسلسل تعلقات کی بنیاد کیا ہے ؟ ابتدائی وحی کے جن واقعاتی پہلوؤں پر تمام مورخین اور محدثین کا اتفاق ہے، واٹ ان کا تو بڑی آسانی کے ساتھ انکار کرتا ہے، اور اپنی طرف سے مفروضوں کی بنیاد پر ایسے پہلو بیان کرتا ہے، جن کا کسی مورخ یا محدث نے کوئی تذکرہ نہیں کیا، پھر اپنے شک پیدا کرنے والے تنقیدی انداز کی طرف مائل ہو جاتا ہے، یہ لکھ کر کہ "یہ سوچنا تو ایک فریب ہو گا کہ وہ مبالغہ آرائی کے ساتھ یا بڑے عمومی انداز میں یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ بعد کی اسلامی تعلیمات بہت کچھ ورقہ کے افکار سے متاثر ہو گئی تھیں،" واٹ نہ توان مواقع کی وضاحت کرتا ہے، جہاں ورقہ کے افکار اثر انداز ہوئے، اور نہ ہی اس بارہ میں تعین کے ساتھ اپنے دلائل پیش کرتا ہے۔

مستقبل کا اثر روایات پر | واٹ کے نزدیک روایت میں شک پیدا ہونے کی ایک وجہ مستقبل کے زمانی اثرات بھی ہیں، جو روایت کی تفصیلات اور بعد میں پیش آنے والے واقعات کے درمیان یکسانیت پیدا کر دیتے ہیں، یہ ایک طرح کی مفاہمت ہے، جو عمداً وجود میں آتی ہے تاکہ کوئی فائدہ حاصل کیا جا سکے، یا کسی شخص کے تقدس کو ثابت کرنے یا اس کے خیالات کو عملاً تشکیل دینے میں اس سے مدد لی جا سکے، واٹ نے اس کی

---

[1] صحیح بخاری۔ تجرید ج ۱ ص ۲۰۱، مطبوعہ ۱۳۹۱ء

مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

اسلام میں بنیادی طور پر شرافت کا معیار یہ ہے کہ امت اسلامیہ کے معاملہ میں اخلاص برتا جائے اس لئے مسلمانوں نے شرافت اور عزت کے بارہ میں اپنے اجداد کے حقوق کا استحصال کیا ہے، چنانچہ ہمیں ابتدائی مسلمانوں کے حالات کی احتیاط سے چھان بین کرنی چاہیے، اگر کسی شخص کے عقیدت مند یا اس کی نسل کے لوگ یہ دعوی کریں کہ ان کا ممدوح ابتدائی دس مسلمانوں میں تھا، تو احتیاط کی وجہ سے ہمیں یہ فرض کر لینا چاہیے کہ غالباً وہ ابتدائی پینتیس (۳۵) مسلمانوں میں سے ایک رہا ہو، مثلاً طبری کہتا ہے، کہ "مذکورہ تینوں افراد کے بعد جو سب سے پہلے اسلام سے وابستہ ہوئے ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوئی، جن کو ابوبکرؓ لیکر آئے تھے، مگر طبری کا یہ بیان مشکوک ہے کیونکہ مذکورہ افراد درحقیقت علیؓ کو ملاکر پانچ تھے، جو عمرؓ کی وفات پر مسلمانوں کے رہنما قرار پاگئے تھے۔ ان کو عمرؓ ہی نے چھ آدمیوں کی مجلس شوری میں انتخاب خلیفہ کے لیے نامزد کر دیا تھا، یہ کہنا مشکل ہے کہ بیس سال پہلے ابتداء اسلام میں یہ لوگ خود ہی یکجا ہو کر محمدؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے ہوں، ان کے نام درج ذیل ہیں، عثمانؓ بن عفان، زبیرؓ بن العوام، عبد الرحمنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص، طلحہؓ بن عبید اللہ ـــــ"[1]

آئندہ خلیفہ کی نامزدگی کے لیے مذکورہ چھ افراد کے انتخاب کی وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے، کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد انھوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا، اس کی

[1] محمد ایٹ مکہ (ترجمہ عربی)، ص ۱۴۵-۱۴۶۔

وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں ان کا احترام تھا، اور قبول اسلام کے شرف کے علاوہ ان کو اس عرصہ میں کافی تجربہ اور علم بھی حاصل ہو چکا تھا، مگر ابتدا میں مسلمان ہونے والوں اور انتخاب خلیفہ کے لیے نامزد کیے جانے والے لوگوں کا پانچ کی تعداد میں ہونا، واٹ کے نزدیک وہ یکسانیت ہے، جس کی وجہ سے وہ اس طرح کی روایتوں میں شک پیدا کرنا چاہتا ہے جب کہ یہ دو روایتیں الگ الگ واقعات سے تعلق رکھتی ہیں، اور تاریخی حیثیت سے دونوں ثابت شدہ ہیں، ان کو بے بنیاد شبہ کی وجہ سے رد نہیں کیا جا سکتا، کسی خاص گروہ کے نقطہ نظر کی حمایت اور اس کی شہرت یا فائدہ کے لیے، واٹ کے نزدیک کچھ روایتیں بعد میں وضع کی گئی تھیں اس لیے اور بھی روایتوں میں وہ اپنے مفروضہ قیاسات کے بل پر شک یا انکار کی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے، مگر دلیل و ثبوت کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ ان روایتوں کو رد نہیں کرتا ہے، البتہ ان میں شبہ پیدا کرنے کے لیے مفروضہ امکان ہی پر اپنی عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے۔

مثلاً ایک امکان یہ ہے کہ طائف سے واپسی کے بعد محمدؐ سے بنی نوفل کے سردار مطعم بن عدی کی حمایت کے بارے میں ہم یہ فرض کر لیں کہ وہ چند شرطوں پر ہوئی تھی، اور ممکن ہے، کہ اس سلسلہ میں مختلف مصادر میں ہم کو کوئی حدیث بھی مل جائے اگر ایسا ہوا تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہوگی، کیونکہ یہ داستان قبیلہ بنو نوفل کی عظمت کو بتانے کے لیے بیان کی جاتی ہے، مگر چونکہ اس سے بنو ہاشم کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوئی تھی، اس لئے وہ روایت بعد میں نظر انداز کر دی گئی، یہی وجہ ہے کہ ابن اسحاق نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ جب کہ ابن ہشام کے یہاں وہ روایت موجود ہے۔[1] دوسری مثال یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں عمروؓ اس سیاسی گروہ میں تھو

[1] محمد ایٹ مکہ۔ ص ۲۲۲۔

جو محمدؐ کے زمانہ میں برسر اقتدار پارٹی سے تعلق رکھتا تھا، وہ ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابوعبیدہؓ کے اتحاد پر مشتمل تھا، پھر عروہ کا سیاسی تعلق عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ کے گروہ سے رہا جس نے ۳۶ھ میں علیؑ اور معاویہؓ دونوں کا مقابلہ کیا، امویوں کے خلاف ۶۳ھ میں جو گروہ بغاوت کا ذمہ دار تھا، اس سے عروہ کا بھی تعلق تھا، یہ پارٹیاں یکساں مقاصد کی حامل نہ تھیں، تاہم ان میں ایک طرح کا تسلسل ضرور پایا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا صورت حال کی روشنی میں یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ عروہ کے روایت کردہ واقعات میں ایسے اشارے موجود ہیں جو اموی قبیلہ کی بری تصویر پیش کرتے ہیں، وہ ان ہی کو محمدؐ اور ابوبکرؓ کی مخالفت کا ذمہ دار ثابت کرتے ہیں، چنانچہ بنی عبد مناف کے رویہ پر محمدؐ کا تاسف، مخالفت کے بڑے رہنماؤں کا ذکر ابوجہل کی طرف سے بدکلامی اور جنگ پر آمادگی کے لیے اصرار، عروہ ہی کی بیان کردہ روایات ہیں۔[1] یہاں مثال کے طور پر ایک بات کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ کہ مکی دور میں محمدؐ نے جو ابتدائی کامیابیاں حاصل کیں ان کی اہمیت کو بھی کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ عروہ کی آئندہ نسلیں جو ایک عرصہ تک ان کی ہم خیال تھیں اور جنھوں نے بعد میں عروہ کے مسلک سے علیحدگی اختیار کر لی تھی وہ محمدؐ کی ابتدائی کامیابیوں کا تذکرہ پسند نہیں کرتی تھیں، اس لیے کہ ان کامیابیوں میں عروہ کا بھی حصہ تھا[2] یہ بات بھی اہم ہے کہ عروہ (جو تاریخی واقعات کے بیان کرنے والوں میں خاص طور پر مشہور تھے) زبیرؓ کے خانوادہ سے تھے جو کسی زمانہ میں امیہ کے خانوادہ کا مخالف تھا، اس لیے عروہ کی خاندانی روایات میں اس مخالفت کا اثر تھا، ان میں محمدؐ کے مخالفین اور قریش کی طرف سے دباؤ کا مبالغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ اموی قبیلہ محمدؐ کے مخالفین میں تھا۔[3]

حضرت عروہؓ پر اعتراض قریش مکہ کے دباؤ اور زبردستی کے بارہ میں واٹ کے طرز عمل کا ابھی ہم جائزہ لیں گے، مگر یہاں اہم بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا اقتباس میں واٹ کے

---

[1] محمد ایٹ مکہ۔ ص ۲۷۰۔ [2] ایضاً۔ ص ۱۷۱۔ [3] ایضاً ص ۲۳۱۔

بیانات کا سارا دارومدار عروہؓ پر ہے، اگر قریش کی زیادتیوں کے بارے میں صرف عروہ ہی نے واقعات بیان کیے ہوتے، تو اس شبہ کی گنجائش تھی کہ بنو امیہ سے انتقامی جذبات نے ان کو مبالغہ آرائی پر آمادہ کر دیا ہو، مگر یہی واقعات ان مؤرخین اور راویوں نے بھی بیان کیے ہیں، جن کا قدیم خاندانی رنجشوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباسؓ نے عقبۂ کبریٰ کی بیعت کے وقت اور فتح مکہ کے موقع پر جو کردار ادا کیا ہے، وہ تاریخ کی کتابوں میں محفوظ اور معروف ہے یہ بھی ایک معلوم حقیقت ہے، کہ حالت شرک میں بھی انھوں نے دعوت اسلامی کا مقابلہ نہیں کیا، اور نہ ہی اذیت رسانی میں حصہ لیا، حالانکہ ان کے بھائی ابولہب کی کارگزاریاں اس کے برعکس تھیں حضرت عباسؓ کا رویہ اس زمانہ میں ایسا تھا کہ انھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے چچا ابوطالب کے انتقال کے بعد ان ہی کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیروں اور حمایتیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے، ایسی روایات بھی موجود ہیں (جن کی صحت کے بارہ میں ہم کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتے) کہ حضرت عباسؓ دور اول ہی میں کسی وقت مسلمان ہو گئے تھے، وہ مکہ میں مقیم تھے تاکہ وہیں رہ کر اپنے خاندانی وقار کے ذریعہ دعوت اسلامی کی خدمت کرتے رہیں، ان کے قبول اسلام کا زمانہ جو بھی ہو، مگر واٹ نے بیعت عقبہ میں ان کی موجودگی تک سے قطعی انداز میں یہ کہہ کر انکار کیا ہے کہ

> عباس کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس کو نظر انداز کر دینا ضروری ہے کیونکہ وہ بعد کے راویوں کا اضافہ ہے، جس کا مقصد یہ تھا، کہ اس زمانہ میں بنو ہاشم کے ذریعہ محمدؐ کے ساتھ جو بدسلوکی کی گئی، اس کو نظروں سے اوجھل کر دیا جائے طائف سے واپسی کے بعد محمدؐ کو بنو نوفل کے سردار کی طرف سے تحفظ حاصل ہو گیا تھا، مگر

بیعت عقبہ میں عباسؓ کی طرف داری اور حمایت کا واقعہ بے اصل ہے، کیونکہ ان کی حمایت کا حوالہ دیا جاتا ہے، اس وقت تو وہ کافر تھے۔[1]

شرک کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش اپنی اس تحریر میں واٹ جس نتیجہ تک پہنچا ہے، وہ یہ ہے، شرک پہلی صدی ہجری کے آخر میں، اپنے مخالفوں کی نظر میں ایک معمولی سا عیب سمجھا جاتا تھا، وہب بن منبہ کی طرف منسوب وہ روایت جو الیہودی کے اوراق میں محفوظ ہے، اس سے ہماری گذشتہ رائے کی تصدیق ہوتی ہے، اس میں یہ ہے، کہ عباس محمدؐ کی مدح کرتے ہیں پھر محمدؐ مدینہ کے ایک شخص کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ عباس کی اور ان کی قابل گرفت باتوں کی تردید کریں اور یہ واضح کر دیں کہ مدینہ کے باشندے ان سے زیادہ محمدؐ سے حسن ظن رکھتے ہیں، یہاں ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے عباسیوں کے پروپیگنڈہ کے خلاف کوئی تردیدی بیان ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہو، یہ فرض کر لینا زیادہ قابل قبول اور بہتر معلوم ہوتا ہے، کہ عقبہ ثانیہ میں عباسؓ کی شرکت ایک بے اصل داستان ہے، جس سے عباسی پروپیگنڈہ نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔[2]

ہجرت کا سبب مسلمانوں پر مشرکانہ قیادت کی طرف سے جو شدید دباؤ پڑا وہ اس قدر معروف اور مشہور روایات سے ثابت ہے کہ اس کو مزید ثابت کرنے کی کوشش بے فائدہ ہوگی مگر تاریخی ماخذ میں قریش کے جس ظلم کا ذکر کیا گیا ہے، واٹ نے اس پر اپنے شک کا اظہار کیا ہے اس نے اس تشدد کا انکار کیا ہے، جس سے نسل در نسل لوگ واقف ہوتے رہے، وہ ظلم وتشدد کے واقعات کو مبالغہ آرائی قرار دے کر مذکورہ روایتوں کو مشکوک قرار دیتا ہے، اور واقعات کو

---

[1] محمد ایٹ مکہ (عربی ترجمہ) ص ۲۳۲ [2] ایضاً ص ۲۳۲ - ۲۳۳

ایسا رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے، جس کی وجہ سے اس کے خیال میں ایک معتدل خاکہ نظر آئے وہ لکھتا ہے کہ :-

”تاریخی مصادر مسلمانوں کے ابتلاء کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا اشارہ ابوجہل کی جیسی کارگزاریوں اور حالات کی طرف ہوتا ہے۔ مگر یہ ابتلاء زیادہ سخت نہ تھا۔ ابن ہشام، طبری اور ابن سعد کی کتابوں کو دقت نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ان کتابوں میں یقیناً بدترین واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن ساری تفصیلات کو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ قریش کی طرف سے حریفانہ دباؤ معمولی تھا، ممکن ہے کہ اس ظالمانہ دباؤ کو مبالغہ آرائی کے ساتھ بیان کرنے کی وجہ یہ ثابت کرنا ہو کہ اس کے باوجود کسی شخص نے بھی دین اسلام کو ترک نہیں کیا، ابن اسحاق کے حوالہ سے جو تاریخی شواہد ہمیں مل سکے ہیں ان میں تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ محمدؐ پر سب وشتم کیا گیا، اور ان کے ساتھ معمولی طرز کے توہین آمیز واقعات پیش آئے۔ مثلاً پڑوسیوں کا کوڑا کرکٹ ان کے گھر کے سامنے ڈال دیا گیا، ابوطالب کی وفات کے بعد، غالباً زچ کرنے کے واقعات میں اضافہ ہو گیا تھا، ابوبکرؓ مسلمان ہوئے، تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے، جو ہجرت کے وقت صرف پانچ ہزار درہم رہ گئے تھے، ابن سعد کے بیان کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ ابوبکرؓ (مسلمان) غلاموں کو خرید لیا کرتے تھے، مگر زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ابوجہل کی طرف سے اقتصادی دباؤ ہی ابوبکرؓ کے سرمایہ میں کمی کا سبب بنا ہو کیونکہ، ایک غلام کی قیمت اس زمانہ میں تقریباً چار سو درہم سے زیادہ نہ تھی، غلاموں پر جسمانی سزاؤں کی مشہور ترین مثالیں وہ ہیں جو بلالؓ اور عامرؓ بن فہیرہ کے ساتھ پیش آئیں، عاص بن وائل نے خباب بن ارت کے

قرض کی ادائیگی روک دی تھی، ظالمانہ دباؤ کی ایک چوتھی قسم کا بھی ہم ذکر کر سکتے ہیں، اور یہ وہ کارروائیاں ہیں جو باپ، چچا یا بھائیوں کی طرف سے خاندان یا قبیلہ کے افراد کے ساتھ کی گئیں۔[1]

واٹ کی ساری بحث کا خلاصہ اس کے اپنے لفظوں میں یہ ہے کہ "مسلمانوں پر معمولی سا دباؤ تھا، کیونکہ مکہ میں مختلف قبیلوں کی طرف سے اپنے آدمیوں کی حمایت کا نظام ایک ایسی رکاوٹ ثابت ہوا، جس کی وجہ سے ایک مسلمان کو دوسرے قبیلہ کے کسی شخص کی طرف سے اذیت نہیں دی جاتی تھی ورنہ اس مسلمان کا قبیلہ بھی مسلمان نہ ہوا ہو تب بھی قبائلی حمایت کا یہ نظام اس کے حق میں حرکت میں آجاتا، دوسروں سے اختلاف کے موقع پر اگر اپنا خاندان حمایت نہ کرے تو یہ بات قبیلہ کی عزت کو مجروح کر دیتی، اسی لیے مسلمانوں پر دباؤ کی صرف درج ذیل صورتیں ہی باقی رہ گئی تھیں،

۱۔ جب قبائلی تعلقات متاثر نہ ہوں اور کسی مسلمان پر اسی کے قبیلہ کے لوگوں کی طرف سے دباؤ ڈالا جائے یا وہ ایسا فرد ہو جس کو کسی بھی قبیلہ کی حمایت حاصل نہ ہو۔

۲۔ ایسی کارروائیاں جو عزت اور شرف کے روایتی قانون کے ذیل میں نہ آتی ہوں مثلاً اقتصادی معاملات یا لفظی سب و شتم جس کا نشانہ کوئی خاص فرد ہو، اور قبیلہ اس کی زد میں نہ آتا ہو۔

مذکورہ بالا دباؤ نئے دین کی ترقی کے لیے تو کافی تھا، لیکن کسی مسلمان کو دین اسلام سے ہٹا دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔[2]

واٹ کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ مسلمانوں پر حریفانہ دباؤ معمولی تھا، اس بارے میں

---

۱ محمد ایٹ مکہ ص ۱۹۰ - ۱۹۱، ۲ ایضاً ص ۱۹۲

ہم تفصیلی گفتگو کے بجائے صرف ان حالات کی طرف اشارہ کریں گے جو مسلمانوں اور ان کے حریفوں کے درمیان پیش آئے،

ہر ایک قبیلہ اپنی حد تک ان مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتا تھا، جو اس سے تعلق رکھتے ہوں یہ آزاد ہوں یا غلام، قبیلہ کے لوگ ان کو قید کر دیتے، مار پیٹ کرتے، بھوک، پیاس سے اور گرمی بڑھ جاتی تو مکہ کی سخت دھوپ میں رکھ کر ان کو اذیت دیتے، ان میں سے کچھ لوگ تو بے پناہ سختیوں کی تاب نہ لاتے اور فتنہ کا شکار ہو جاتے، اور جو ڈٹے رہتے ان کو اللہ تعالیٰ ان کی دست درازیوں سے محفوظ فرماتا، ایک راوی مجاہد کا یہ بیان ہے کہ کمزور اور ناتواں مسلمانوں کو لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں ڈال دیا جاتا، اور ان کی تکلیف اپنی انتہا کو پہنچ جاتی،[1]

دوپہر میں جب دھوپ تیز ہو جاتی تو بنو مخزوم کا قبیلہ، حضرت عمار بن یاسر اور ان کے والدین کو مکہ کی تپتی ہوئی ریت پر ڈال کر تکلیف پہنچاتا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گزرتے ہوئے یہ منظر دیکھتے، تو فرماتے کہ اے خاندان یاسر! صبر کرو، تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے، عمارؓ کی والدہ اسلام پر جمی رہیں تو ان کو قتل کر دیا گیا، یہ بھی روایت ہے کہ انھوں نے ابوجہل کو سختی سے جواب دیا تو اس نے ان کے شکم پر نیزہ سے وار کیا۔۔۔۔۔ عمارؓ کو اس قدر تکلیف دی جاتی کہ انھیں اس بات کا بھی ہوش نہ رہ جاتا کہ وہ زبان سے کیا کہہ رہے ہیں۔[2]

خبابؓ بن ارت کو پکڑ کر، زمین پر گرم چٹانوں سے ان کی پشت کو لگا دیا جاتا جس سے ان کی چربی پگھل کر ختم ہو جاتی، خبابؓ کا بیان یہ ہے کہ ایک دن لوگوں نے آگ جلائی پھر

---

۱ البلاذری (م ۲۷۹ ھ) انساب الاشراف ج ۱ ص ۱۵۸ تحقیق ڈاکٹر محمد حمید اللہ معہد المخطوطات لجامعۃ الدول العربیۃ دار المعارف، قاہرہ ۱۹۵۹ء ۲ ایضاً ج ۱ ص ۱۵۸-۱۵۹

اس پر مجھے ڈال دیا اور ایک آدمی نے میرے سینہ پر اپنا قدم رکھدیا میں پشت کے بل زمین پر پڑا تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ "تم میں سے کوئی بھی موت کی تمنا نہ کرے" اگر میں نے آپ سے یہ ارشاد نہ سنا ہوتا تو اس دن میں اللہ سے موت مانگ لیتا۔[1]

مسلمانوں پر زیادتیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ کچھ مسلمان ان مصیبتوں سے ڈانواں ڈول ہوگئے تھے، وہ اس ظلم کے مقابلہ میں برداشت کی طاقت کھو بیٹھے یہاں تک کہ مسلمانوں سے اللہ تعالے نے جس مدد کا وعدہ کیا ہے۔ اس پر ان کے دلوں میں شک پیدا ہونے لگا انھوں نے اس کا تذکرہ کیا تو سورۂ حج کی درج ذیل آیتیں نازل ہوئیں، جن میں ایسے لوگوں پر عمومی انداز میں موثر طریقے سے تنبیہ کی گئی ہے۔[2]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللهَ — اور لوگوں میں سے کوئی کوئی آدمی اللہ کی

عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ — عبادت کرتا ہے کنارہ رکھر، پھر اگر

اِطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ — اس کو کوئی فائدہ ہوا تو مطمئن رہا، اور

فِتْنَةُ اِنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ — کچھ آزمائش ہوگئی تو منہ اٹھا کر چل دیا،

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ — دنیا و آخرت دونوں کو کھو بیٹھا یہی

ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ — کھلا ہوا نقصان ہے۔ (سورۃ الحج ۱۱)

سعید بن جبیر نے عبد اللہ بن عباس سے یہ پوچھا کہ کیا مشرکین، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو اس قدر سزائیں دیتے تھے، جن پر ان مسلمانوں کو دین سے اظہار برادت پر معذور

---

[1] محمد عزت دروزہ۔ سیرت الرسول (صور مقتبسہ من القرآن الکریم) طبع دوم ج اص ۲۸۳-۸۴ مطبع عیسی البابی قاہرہ سنہ ۱۹۶۵ء

[2] البلاذری (م ۲۷۹ھ) انساب الاشراف ج ا ص ص ۱۵۰۔ ا تحقیق ڈاکٹر محمد حمید اللہ معہد المخطوطات بجامعۃ الدول العربیۃ دارالمعارف، قاہرہ ۱۹۵۹ء ج ا ص ۱۰۰

قرار دے دیا جاتا تھا؟ انھوں نے فرمایا، اللہ کی قسم! یہی بات تھی، یہ لوگ مسلمانوں کو اتنا مارتے اور بھوکا اور پیاسا رکھتے کہ وہ اس کی وجہ سے ٹھیک سے بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔[1]

ہجرت حبشہ کی وجہ؟ واٹ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق مکہ مکرمہ میں سیرت طیبہ کے ایک مشہور واقعہ کا غالباً انکار کرنا چاہتا ہے۔ اس بات کا انکار کہ مسلمانوں نے مشرکین کے دباؤ سے مجبور ہو کر حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی، وہ اس ہجرت کا دوسرا سبب بیان کرتا ہے، اور وہ یہ کہ مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے، اور ان کے اس اختلاف کی وجہ سے ایک طبقہ کو ہجرت حبشہ کا حکم دیا گیا، تاکہ مسلمانوں میں باقاعدہ دو پارٹیاں وجود میں نہ آسکیں۔

ہجرت حبشہ اور پھر وہاں ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں کے قیام کا تجزیہ کرنے میں واٹ پانچ اسباب کے درمیان سرگرداں اور پریشان نظر آتا ہے، یہ اسباب درج ذیل ہیں،

۱۔ ظالمانہ دباؤ سے بچ نکلنے کی کوشش، (۲) ارتداد کے خطرہ سے دور ہوجانے کی خواہش (۳) تجارتی دلچسپیوں کو برقرار رکھنے کا جذبہ (۴)، حبشہ کے باشندوں سے جنگی امداد کے حصول کے لیے جدوجہد،

واٹ کو مذکورۂ بالا چاروں اسباب پر اعتماد کر لینے میں کوئی افادیت نظر نہیں آئی اس لیے وہ ان سے مطمئن نہیں ہے، اور ان پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ

اس خیال کو رد کر دینا بڑا مشکل ہے، کہ ہجرت حبشہ کی پانچویں وجہ ہی لازمی طور پر اطمینان بخش ہے، یعنی یہ بات کہ اسلام کی نوخیز امت کے اندرونی معاملات میں فکری حیثیت سے بڑی تفریق پیدا ہوگئی تھی۔[3] (اس سے پہلے واٹ اپنا یہ خیال بھی بیان کرچکا ہے کہ، حبشہ میں خالد بن سعید کے طویل قیام سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے، کہ ان کو

---

[1] ابن ہشام۔ تہذیب ص ۷۶، البلاذری انساب ج ا ص ۱۹۷ [2] محمد ایٹ مکہ۔ ص ۱۸۲-۱۸۹۔

محمدؐ کی سیاست سے اختلاف تھا، وہ اسلام کی بڑھتی ہوئی سیاسی نوعیت سے متفق نہیں تھے، محمدؐ کی نبوت کی وجہ سے وہ ان کے سیاسی کردار کی اہمیت سے بھی اختلاف رکھتے تھے، خالد کو رسالت کے سیاسی پہلوؤں کا لحاظ و اہتمام ہوتا تو وہ محمدؐ کے ساتھ اپنے اختلاف کو نظر انداز کر کے ۸ھ سے پہلے ہی مکہ واپس آجاتے [1]۔

واٹ نے چند واقعات سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا، اس کے نزدیک یہ اختلاف خاص طور پر حضرت ابوبکرؓ سے تھا، جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں طاقت و پوزیشن حاصل تھی، واٹ کے خیال میں اس اختلاف سے پیدا ہونے والے امکانی خطروں کے بدلہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کے مخالفوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا، مگر واٹ کی طرف سے اس بارہ میں جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں، وہ ناکافی اور کمزور ہیں، حضرت عثمانؓ اور حضرت طلحہؓ یا بعض اور دوسرے حضرات جنھوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی وہ تو حضرت ابوبکرؓ ہی کے رفقاء کار تھے، مہاجرین اولین میں ایک تعداد ان لوگوں کی ہے، جو نمایاں شہرت کے مالک نہ تھے، بعد میں اور خصوصاً صدیق اکبرؓ کے دور میں بھی سیاسی حیثیت سے ان کا کوئی اہم حصہ نہیں تھا، اس کو اختلاف کا شاخسانہ قرار دینا ممکن نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ زندگی کے دوسرے مشاغل میں لگے ہوئے تھے حقیقی صورت حال تو یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بڑی تعداد میں ایسے لوگوں سے بھی تعاون لیا جو فتح مکہ کے موقع پر یا اس کے بعد ایمان لائے تھے، ان لوگوں سے بھی جن کے خاندانی بزرگوں نے اسلام سے معرکہ آرائی کی تھی، حضرت ابوبکرؓ کسی کو اس کے ماضی کی وجہ سے نظر انداز کرتے تو ان لوگوں کو یقیناً نظر انداز کر دیتے، ان کو نوجوان کی قیادت بھی نہ دیتے، مگر

[1] محمد ایٹ مکہ۔ ص ۱۶۲۔

فوجی مناصب ان کو دیئے گئے، اور انھوں نے یہ خدمات بحسن و خوبی انجام دیں، قرآنی آیات [1] سے ثابت ہوتا ہے، کہ ہجرت کی وجہ وہ شدید دباؤ تھا جس سے مسلمان دوچار ہوئے، مشرکین کی طرف سے اذیت رسانی کے ایسے طریقے اختیار کئے گئے، جن کی وجہ سے مسلمان ہجرت پر مجبور تھے، اور اسی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہجرت کرنے کا مشورہ دیا [2]، حضرت ابوبکرؓ بھی ہجرت پر مجبور اور آمادہ ہو چکے تھے، مگر ایک قبیلہ کے سردار نے ان کو اپنی پناہ میں لے لیا [3]۔

مکہ میں دعوت اسلامی کا بنیادی امتیاز: سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جن میں کسی چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے، مگر واٹ نے ان میں بھی صداقت سے روگردانی کر کے صحیح صورت حال کا انکار کیا ہے، اور شک و شبہہ کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ وہ اپنے مفروضہ تخیل کی مدد سے واقعات کا تجزیہ کر سکے، اس کا خیال یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں مورتیوں کی پوجا پر براہ راست تنقید کبھی نہیں کی البتہ مکہ کے اطراف میں جو مورتیاں نصب تھیں آپ نے ان کو نامزد کر کے تنقیدی باتیں کہیں، اس لیے مکہ میں آپ کی مخالفت کی بنیادی وجہ یہ نہیں تھی کہ مکہ کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر یہ اندیشہ تھا، کہ اس کے نتیجہ میں گرد و پیش کے عرب زیارت کعبہ کا سفر بند کر دیں گے، اور مکہ کی تجارت تباہ ہو جائے گی، مخالفت کی یہ وجہ قابل قبول نہیں ہے، قرآن مجید میں کعبہ کے بتوں پر کوئی تنقید نہیں کی گئی ہے،

[1] دیکھئے سورۂ عنکبوت آیت: ۲۳، بروج ۱۰، قصص ۵، زمر ۱۰، نحل ۴۱، ۱۱۰۔
[2] ڈاکٹر صالح احمد علی۔ محاضرات فی تاریخ العرب ج ۱ ص ۲۹۸ مطبع الزعیم بغداد ۱۹۶۱ء
[3] البلاذری۔ انساب ج ۱ ص ۲۰۵-۲۰۶۔

البتہ گرد و پیش کے بتوں کا ذکر کیا گیا ہے، مگر ان بتوں سے دست برداری کے بعد مکہ کی تجارت کو کیا نقصان پہنچا (اس تفصیل کے بعد واٹ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فتح مکہ کے ذریعہ مکہ میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کی حیثیت ثانوی تھی)[1]

مگر شروع میں اور پھر فتح مکہ کے موقع پر، اور بتوں کی شکست و ریخت کے وقت بھی کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے علی الاعلان بت پرستی کی مخالفت نہیں کی گئی، یہ بت مکہ میں ہوں یا اس کے اطراف میں، بہر حال آپ کی مخالفت واضح تھی (اور اس پر آپ نے جب عمل درآمد کیا تو اس کی وجہ سے مکہ میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئیں، ان تبدیلیوں کو ثانوی حیثیت دینا کیونکہ درست ہوسکتا ہے،) واٹ نے دوسرے مستشرقین کی تقلید میں جو تجزیہ کیا ہے وہ تاریخ اور عقیدہ دونوں کے لحاظ سے ناقابل قبول ہے۔

اسلام نے توحید خالص کی دعوت دی تھی۔ اس نے ابتدا ہی سے شرک اور بت پرستی کا انکار کیا، قریش مکہ کی قیادت کو اس کا بخوبی احساس تھا، اور یہی وجہ ہے کہ توحید کی اس دعوت کو ترک کر دینے پر وہ آپ کے ہر ایک مطالبہ کو منظور کرنے کے لیے تیار تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان سے ہر معاملہ پر گفتگو کے لئے آمادہ تھے، مگر توحید الٰہی کی قیمت پر آپ کو کوئی سمجھوتہ منظور نہیں تھا۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے ایک طرف تو واٹ کا دعویٰ ہے اور دوسری طرف تاریخی حقائق ہیں بلاذری کی روایت یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے بتوں اور ان کے دوسرے معبودوں پر اپنی تنقیدوں میں شدت پیدا کر دی، تو قریش کی طرف سے دعوت اسلامی کی مخالفت میں بھی شدت پیدا ہوگئی[2]۔ ابن ہشام[3] اور طبری[4] کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ مشرکین نے

---

[1] محمد ایٹ مکہ ص ۲۱۲-۲۱۳-۲۱۴ [2] انساب ج ۱ ص ۱۱۵-۱۱۶ [3] تہذیب ابن ہشام ص ۵۰-۷۰، [4] طبری تاریخ الرسل والملوک، تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم، دار المعارف قاہرہ ۱۹۶۲-۱۹۷۱ء دیکھئے ج ۲ ص ۳۳۲-۳۳۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر پکڑ لی اور یہ پوچھا کہ کیا آپ ہی نے ہمارے دین اور معبودوں کی مذمت میں ایسی ایسی باتیں کہی ہیں؟ فرمایا! ہاں! میں نے ہی یہ باتیں کہی ہیں، ابن ہشام نے یہ لکھا ہے، کہ سرداران قریش یکجا ہوئے، اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گفتگو کے لیے مدعو کیا۔ اور آپ سے یہ کہا کہ واللہ! ہمارے علم کی حد تک عربوں میں کوئی شخص ایسا نہیں گزرا جس نے آپ کی طرح اپنی قوم کو آفت میں مبتلا کیا ہو، آپ نے ہمارے بزرگوں کو غلط کار بنایا، ہمارے دین کی مذمت کی، معبودوں کو بے وقار کہا، عقل مندوں کو ناسمجھ قرار دیا اور ہمارے اتحاد کو ختم کر دیا، اگر ایسی باتوں سے آپ کا مقصد حصول دولت ہے تو ہم اتنا دیں گے کہ آپ سب سے بڑھکر دولت مند ہو جائیں، اور اگر جاہ و منزلت درکار ہو تو ہم آپ کو اپنا سردار تسلیم کر لیں گے (ان کی ساری گفتگو سن کر) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جواب دیا کہ جو پیام میں نے تمہارے سامنے پیش کیا ہے، اس کا مقصد دولت، جاہ و منزلت یا بادشاہت کا حصول نہیں ہے، مجھے تمہارے پاس اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے، تم میرے پیام کو قبول کروگے تو دنیا و آخرت میں اپنا حصہ پا جاؤ گے اور اگر اسے رد کر دوگے تو میں امر الٰہی پر صبر کروں گا، یہاں تک کہ اللہ، میرے اور تمہارے درمیان کوئی اور فیصلہ فرما دے۔[1]

ابن سعد نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ سرداران قریش کا ایک وفد ابو طالب کے پاس یہ درخواست لیکر گیا کہ وہ اپنے بھتیجے کو باز رکھیں انھوں نے آپ کو طلب کیا اور کہا کہ اے برادر زادے! یہ لوگ تمہارے باپ کے بھائی بند اور قوم کے سردار ہیں، اور تم سے انصاف کے طالب ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:- آپ لوگ اپنی بات کہیں، میں غور کروں گا، ان لوگوں نے کہا، تم ہم کو اور ہمارے معبودوں کو چھوڑ دو ہم تمہیں اور

---

[1] تہذیب ابن ہشام۔ ص ۶۹-۷۰۔

تمہارے معبود کو چھوڑ دیں گے۔" ابوطالب نے قوم کی یہ بات سنی تو آپ سے کہا، "قوم نے تم سے انصاف کی بات کہدی ہے، اس کو منظور کر لو"، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے، میں یہ معاہدہ کر لوں گا مگر اس کے بدلہ میں آپ سب میری ایک بات مان لیں وہ بات ایسی ہے کہ اگر آپ لوگ اس کا اقرار کر لیں گے تو سارے عرب پر آپ کی حکمرانی ہوگی، اور عجم آپ لوگوں کے سامنے سرنگوں ہو جائے گا۔" یہ بات سن کر ابوجہل نے کہا۔ تمہارے باپ کی قسم ایہ تو بڑے فائدہ کی بات ہے، ہم یہ بات ضرور مانیں گے بلکہ اس جیسی دس باتیں ہوں تو وہ بھی ہمیں منظور ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آپ لوگ یہ ایک بات تسلیم کر لیں، "لا الٰہ الا اللہ" (اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے)، یہ بات سنتے ہی ان کے چہرے بدل گئے اور تکدر اور ناراضگی کے ساتھ یہ کہکر انھوں نے مجلس برخاست کر دی کہ چلو اور اپنے معبودوں پر قائم رہو، بھلا یہ بھی کوئی مطلب کی بات ہوئی۔"[1]

واٹ نے اپنی کتاب میں کئی جگہ یہ بات لکھی ہے کہ "تحریک اسلامی کے ذریعہ جو مذہبی تبدیلیاں ہوئیں وہ محض سیاسی اقتصادی، یا سماجی نوعیت کی تھیں۔" حالانکہ اس کو منطقی انداز میں یہ بتانا چاہیئے تھا، کہ نئی دعوت اسلامی کے ذریعہ مکہ کے حالات کے مطابق کامل تبدیلیوں کی کیا صورت ممکن تھی، جو وجود میں نہیں آئی مگر چونکہ واٹ کا رویہ تعمیری اور مثبت نہیں ہے اس لئے وہ ایک ہی بات پر زور دینا چاہتا ہے کہ "فتح مکہ کے ذریعہ جو تبدیلیاں ہوئیں وہ ثانوی درجہ کی تھیں۔" وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ اسلام قبول کرنے کی صورت میں اہل مکہ کو اقتصادی نقصانات کا اندیشہ تھا۔[2] مگر وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں دعوت اسلامی کے ذریعہ سماجی زندگی میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان میں اقتصادی ترقیاں بھی شامل ہیں، حالانکہ

۱؎ طبقات ابن سعد ۱۳۵/۱/۱ ۲؎ محمد ایٹ مکہ۔ ص ۲۱۴

دونوں باتوں میں تضاد ہے۔

قریش کے منصوبۂ قتل کا انکار

دونوں باتوں میں تضاد ہے۔ طبری اور ابن ہشام کی ایک مشہور روایت میں یہ ہے کہ ہجرت مدینہ سے کچھ پہلے مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں اپنا آخری موقف طے کرنے کے لئے ایک مشاورتی اجتماع ہوا، اس اجتماع میں سرداران قریش یکجا تھے، واٹ نے اس روایت پر بھی اپنے شبہات کا ذکر کیا ہے، اس کا خیال یہ ہے کہ اس موقع پر ان لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیئے جانے سے اتفاق نہیں کیا تھا، واٹ نے اس کے بجائے حسب عادت ایک دوسرا مفروضہ پیش کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ غالباً اس اجتماعی مشورہ کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سنگ باری ہوئی تھی۔

"یہ ایک واقعہ ہے کہ (سرداران قریش کی طرف سے) ایک مشاورتی اجتماع ہوا تھا، اس کے شرکا نے یہ محسوس کیا کہ محمدؐ ان کے بارہ میں مخالفانہ منصوبے بنا رہے ہیں، جیسا کہ ابن اسحاق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، بعد میں پیش آنے والے واقعات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مشورہ کی اس نشست میں محمدؐ کو قتل کر دینے کے خیال سے لوگ متفق نہیں تھے، تاریخی مصادر کی تصریحات کے برعکس یہ ایک حقیقت ہے کہ اجتماعی نشستوں میں قتل کے منصوبوں پر کوئی اتفاقی فیصلہ نہیں ہوتا، غالباً اس خطرہ کے جلد ہی پیش آجانے کا خوف تھا، جس کی وجہ سے محمدؐ نے سفر میں عجلت کی۔ لیکن محمدؐ اور ان کے پیروکاروں کو جو خطرہ درپیش تھا، اس کی صحیح نوعیت کو ٹھیک ٹھیک بیان کرنا مشکل ہے، ہجرت کی داستان کو آراستہ کرنے کے لیے اس میں بہت سے اضافے کر دیے گئے ہیں یہاں تک کہ تاریخ کے ابتدائی مصادر میں اضافے موجود ہیں، مگر یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے، کہ محمدؐ پر قریش کے مشاورتی جلسہ کے بعد سنگ باری کی گئی ہو۔"[1]

۱؎ محمد ایٹ مکہ۔ ص ۲۳۱

"واٹ کی کتاب کا یہ اقتباس بھی تحقیقی کاوش کے بجائے ظن اور تخیل پر مبنی ہے، ایک بات فرض کر لی گئی، اور اس کی روشنی میں تاریخی حقائق کو نظر انداز کر دیا گیا، اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل و ثبوت کی ضرورت بھی نہیں سمجھی گئی۔ قریش کی طرف سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روز افزوں مخالفت اور آپ کی طرف سے ان کے عقائد و رسوم کی علی الاعلان تردید کے بعد آپ کو قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا گیا، جس کا تاریخی شواہد میں ذکر موجود ہے، قتل کا یہ منصوبہ جن لوگوں نے بنایا تھا، وہی جب بعد میں مسلمان ہو گئے تو انھوں نے بھی پچھلے منصوبوں کی تردید نہیں کی، بلکہ مزید تائیدی بیانات فراہم کر دیے، ایسی صورت میں واٹ کی طرف سے ایک "غالباً" کا سہارا استشراقی تحقیقات کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ہے، اس کے ذریعہ تو خود واٹ کی نیت بے نقاب ہو جاتی ہے، مگر وہ بڑی جرأت کے ساتھ سرداران قریش کی نیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔[۶۷]

قیاس اور تخیل کی مدد سے واٹ کی واقعات آفرینی

واٹ نے اپنے خیال کی مدد سے ایسے واقعات اور طے شدہ نتائج فرض کر لیے ہیں، جن کا سیرت و تاریخ کے واقعات میں کوئی وجود ہی نہیں ہے، وہ کبھی تو کسی کمزور روایت کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی کسی ایسی بات پر زور دیتا ہے، جو سرے سے بے اصل ہو، اگرچہ تاریخ اسلامی کے ابتدائی دور کے عام رجحانات اور اس زمانہ کے رنگ اور مزاج سے وہ روایت ذرا بھی میل نہ کھاتی ہو۔

وہ اس روایت میں تو شک پیدا کرتا ہے، جس کے صحیح ہونے کے امکانات ہوں اور اس روایت کی تائید کرنا چاہتا ہے، جس کے غلط اور دروغ ہونے کے سارے قرائن موجود ہوں، واٹ کا طرز عمل دونوں صورتوں میں ایک سکہ کی طرح ہے جس کے دو رخ ہوں، مگر دونوں ہی

۶۷؎ اضافہ از مترجم۔

سورتوں میں تخریب کاری اور توڑ پھوڑ کی ذہنیت کام کر رہی ہے

مثلاً قرآن مجید کی جس آیت میں سجدۂ تلاوت کو چھوڑ دینے پر تنبیہ کی گئی ہے۔[۱] اس پر اپنی تحریر کا آغاز واٹ نے اس فقرہ سے کیا ہے کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ غالباً یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ "۔۔۔۔۔۔ اس فقرہ کے بعد وہ اپنا یہ مفروضہ بیان کرتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی صف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت یا دین سے ارتداد کا ایک واقعہ ہو سکتا ہے جس کی طرف آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔[۲] اسی طرح طائف سے واپسی کے بعد نخلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ایک تجربہ ہوا، اور جس کا تذکرہ سورۂ احقاف (۲۹-۳۲) میں کیا گیا ہے،[۳] اس واقعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روحانی طور پر تقویت ملی تھی مگر واٹ کا خیالی مفروضہ یہ ہے، "دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانی معاشرہ کے بارہ میں بے اعتمادی کا شکار ہو گئے تھے، اور جب مذکورہ آیتیں نازل ہوئیں تو آپ کی اعصابی کمزوری ختم ہوئی اور آپ مطمئن اور پرسکون ہو گئے۔"[۴] مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت قدمی، استقلال اور آپ کی

۱؎ سورۃ الانشقاق: ۲۱، وإذا قرئ علیهم القرآن لا یسجدون:- ان مشرکوں کے سامنے جب قرآن کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تب بھی یہ سجدہ نہیں کرتے (شرک اور بت پرستی میں مبتلا رہتے ہیں) ۲؎ محمد ایٹ مکہ۔ ص ۲۱۱ ۳؎ ان آیتوں کا ترجمہ یہ ہے۔ اور جب ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کے پاس لے آئے جو قرآن سننے لگے تھے وہ قرآن سنتے ہوئے کہنے لگے کہ خاموش رہو قرآن پڑھا جا چکا تو وہ اپنی قوم کے پاس جا کر کہنے لگے کہ اے بھائیو ہم ایک کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، اور حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اے بھائیو تم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانو اور اس پر ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ تمھارے گناہ معاف کر دے گا اور دردناک عذاب سے محفوظ رکھے گا اور جو اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا نہ مانے گا، وہ زمین میں کسی کو ہرا نہیں سکتا اللہ کے سوا کوئی اور اس کا حامی بھی نہیں ہوگا۔ ایسے لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔ ۴؎ محمد ایٹ مکہ ص ۲۱۷

حوصلہ مندی کی صفات اس قدر نمایاں ہیں کہ ان کو ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانی معاشرہ پر ہمیشہ اعتماد رہا، اور دعوت اسلامی کا کام کرتے ہوئے آپ کے اعصاب کبھی بھی رو بہ زوال نہیں ہوئے، آپ نے طائف سے واپسی کے بعد اپنا یہ مشہور جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ

ان لم یکن بک غضب علیّ فلا أبالی

اے اللہ! اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں تو پھر مجھے (لوگوں کی طرف سے ایسے سلوک کی) کوئی پرواہ نہیں ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فقرہ، حالات کے مقابلہ میں آپ کی اعصابی قوت کو بتا رہا ہے، اور یہ بھی کہ آپ کو نصرت الٰہی پر کتنا اعتماد تھا، اور دعوتی سفر کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے آپ کے اندر کس قدر صلاحیت اور قوت برداشت موجود تھی۔

حضرت خدیجہؓ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری زوجہ محترمہ حضرت سودہؓ بنت زمعہ تھیں ان کے بارہ میں واٹ لکھتا ہے کہ

محمدؐ کے ساتھ ان کے تعلقات کے بارہ میں ہم یہ فرض کئے لیتے ہیں کہ وہ اپنے مخدوم کے ساتھ خادمانہ نوعیت کے تھے، مگر یہ تعلقات کس طرح کے تھے اس کو کوئی نہیں جانتا، اس مجہول تخیل کے تائیدی واقعات کیا ہیں، ان کی بھی کسی کو خبر نہیں ہے[1]

واٹ کا ایک مفروضہ خیال یہ ہے کہ ۷ھ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین حبشہ کو مدینہ طیبہ میں اس لیے بلایا تھا کہ وہ اس چھوٹے سے گروہ کے بل پر مدینہ میں اپنی مرکزی پوزیشن کو طاقتور بنانا چاہتے تھے[2]

واٹ کے مذکورہ بالا بیانات بے اصل ہیں، اس نے اپنے تخیل کی مدد سے صحیح صورت حال کو

---

[1] محمد ایٹ مکہ۔ ص ۲۱۷ [2] ایضاً ص ۱۸۱۔

بگاڑنے کی کوشش کی ہے وہ واقعات کو بیان کرتے ہوئے اپنے قیاس سے تاریخ سازی کرنے لگتا ہے، اور اس پر دلیل وثبوت کے بغیر ہی اپنی عمارت تعمیر کرتا چلا جاتا ہے دراصل ظن اور تخیل کے پیدا کردہ فرضی واقعات اور شاذ اور ضعیف روایتوں پر اعتماد مستشرقین کی تحقیقات کا بنیادی امتیاز ہیں، واٹ نے ایسی ہی باتوں کو اپنے پسندیدہ اسلوب میں توثیق اور اعتماد کی سند دی ہے، اس پر بڑا زور صرف کیا ہے، مگر جب وہ تاریخ کے ثابت شدہ حقائق کو بیان کرتا ہے، تو اس کا اسلوب درماندگی کا شکار ہو جاتا ہے، تاکہ ان میں شک پیدا کرنے یا ان کا انکار کرنے میں اسے زیادہ جدوجہد نہ کرنی پڑے۔ تحریر میں زور اور قوت پیدا کرنے والے الفاظ کو دھیان میں رکھتے ہوئے۔ واٹ کا درج ذیل بیان پڑھئے :

”ہم کو دو واقعات ملتے ہیں ہم ان دونوں کو ثابت شدہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ محمدؐ نے کسی وقت قرآن کا جزء سمجھکر چند آیتیں پڑھ دیں جو شیطان کی طرف سے کہی گئی تھیں یہ بات ممکن نہیں ہے کہ غیر مسلموں یا بعد کے مسلمانوں نے یہ کہانی اپنی طرف سے گھڑلی ہو، محمدؐ نے بعد میں یہ اعلان کیا کہ ان فقروں کو قرآن کا حصہ نہ سمجھا جائے، بلکہ ان کی جگہ ایسی آیتیں پڑھی جائیں جو اپنے مفہوم میں ان سے بالکل ہی مختلف ہیں، ابتدائی روایتوں سے وہ زمانہ متعین نہیں ہوتا، جس میں ایسا واقعہ ہوا تھا، قرین قیاس یہ ہے کہ یہ چند ہفتوں یا چند مہینوں کے بعد ہوا ہوگا، یہاں ایک تیسرا واقعہ بھی ہوا اسے ہم کئی واقعات کا مجموعہ بھی کہہ سکتے ہیں، اور اس کی صحت پر ہمیں اعتماد بھی ہے، وہ یہ کہ محمدؐ اور ان کے مکی معاصرین کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ قرآن میں چند معبودوں کی نشاندہی کریں، لات جس کی طائف میں پوجا کی جاتی تھی، عزیٰ جس کی مکہ کے قریب بطن نخلہ میں پوجا ہوتی تھی، اور منات جس کی جگہ

مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع تھی، . . . . . . تو شیطانی فقروں کا مفہوم یہ تھا، کہ مکہ کے گرد و پیش عبادت خانوں میں یکجا ہونا پسندیدہ بات ہے، لیکن جو آیتیں ان مقامات میں پوجا کو ناپسندیدہ کہتی ہیں، وہ کعبہ میں پوجا کو حرام قرار نہیں دیتیں، ہم کو لازمی طور پر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ جن آیتوں کے ذریعہ سورۂ نجم کی تصیح کی گئی تھی، وہ دوسرے عبادت خانوں کے بدلہ میں کعبہ (میں پوجا) کی تقدیس بیان کرتی تھیں، البتہ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ اس سے پہلے چند ایسی آیات موجود تھیں، جو کعبہ میں پوجا کو حرام قرار دے رہی تھیں، اور بعد میں انھیں قرآن سے نکال دیا گیا تب کعبہ میں پوجا کی اجازت کا ہمارا خیال درست نہیں ہوگا، لیکن ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے، جس سے ہم اس طرح کی بات کو ثابت کرسکیں، یہاں ہمیں یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ محمدؐ کا ستارۂ اقبال بلند ہوا تو گرد و پیش کے یہ عبادت خانے ڈھا دیئے گئے . . . ."

بہر حال شیطانی فقروں کی اہمیت قابل لحاظ ہے، کیا محمدؐ نے ان کی صحت کو اس لئے مان لیا تھا کہ وہ مدینہ، طائف اور پڑوسی قبائل میں اپنے حامیوں میں اضافہ کرنا چاہتے تھے، ؟ کیا وہ اپنے پیروکاروں کی تعداد بڑھا کر قریش کے مخالف لیڈروں کے اثرات کو کم کرنا چاہتے تھے، ؟ مذکورہ عبادت خانوں کا تذکرہ اس بات کی دلیل ہے کہ محمدؐ کا نقطۂ نظر اب وسیع ہو چلا تھا۔ (۱۱) (باقی)

سلسلۂ سیرۃ النبیؐ

یہ دار المصنفین کا یہ مقدس سلسلہ سات حصوں پر مشتمل ہے۔
جسکی مجموعی قیمت ۲۸۰ روپیے ہے۔ (منیجر)

قُلِ الْعَفْوَ

(علامہ اقبال کی نظم "صدیقؓ" قرآن اور احادیث کی روشنی میں)

از
جناب محمد بدیع الزماں صاحب، ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، پھلواری شریف، پٹنہ،

دُنیاوی جاہ و جلال، شان و شوکت اور مال و دولت سے بے رغبتی دینِ اسلام کی رُوح ہے، یہی علّتیں انسان میں تکبّر اور رعونت اور معاشرہ میں عدم مساوات کا موجب بنتی ہیں، اسی لئے قرآن اور احادیث میں مال خرچ کرنے کی ترغیب اور ساتھ اس کے فضائل مختلف طریقوں سے مختلف موقعوں پر ذہن نشین کرائے گئے ہیں حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدسؐ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ

ہر اُمّت کے لئے ایک فتنہ ہوتا ہے، میری امت کا فتنہ مال ہے"۔ (ترمذی، مشکوٰۃ، بحوالہ فضائلِ صدقات۔ حصّہ اوّل)

راہ خدا میں خرچ کرنے کے لئے کچھ اصول و ضوابط متعین کیے گئے ہیں۔ فرمایا۔

"پوچھتے ہیں۔ ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں ؟ (وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ) کہو۔ جو کچھ تمھاری ضرورت سے زیادہ ہو (قُلِ الْعَفْوَ) اس طرح اللہ تمھارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے، شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو"!

(سورۃ البقرہ۔ ۲-۲۷)

"قُلِ الْعَفْوَ" کی صراحت مختلف روایات میں اس طرح آئی ہے۔

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اپنے اہل وعیال سے جو بچے وہ "عفو" ہے"
حضرت ابو امامہؓ حضور اقدسؐ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "اے آدمی! جو تجھ سے
زائد ہے، اس کو تو خرچ کر دے، یہ بہتر ہے تیرے لیے، اور تو اس کو روک رکھے
یہ تیرے لیے بُرا ہے، اور بقدر ضرورت پر کوئی ملامت نہیں، اور خرچ کرنے میں
ان لوگوں سے ابتدا کر جو تیرے عیال میں ہیں، اور اونچا ہاتھ (یعنی دینے والا ہاتھ)
بہتر ہے، اُس ہاتھ سے جو نیچے ہو (یعنی لینے کے لیے پھیلا ہوا ہو) حضرت عطا کو بھی
یہی نقل کیا گیا کہ "عفو" سے مراد ضرورت سے زائد ہے"۔ (در منثور)

کتنا خرچ کیا جائے، اس کا تناسب تو مندرجہ بالا آیات و روایات سے واضح ہے، مگر
سوال یہ ہے کہ خیرات کی ہی کیوں جائے، یا صدقہ کیوں دیا جائے، ان کا جواب بھی قرآن ہی
میں بہ صراحت مذکور ہے۔

جس نے (راہ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا، اور بھلائی
کو سچ مانا، اس کو ہم آسان راستے کے لئے سہولت دیں گے، اور جس نے بخل کیا،
اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی، اور بھلائی کو جھٹلایا، اس کو ہم سخت راستے کیلئے
سہولت دیں گے، اور اس کا مال آخر کس کام آئے گا، جب کہ وہ ہلاک ہو جائے؟
بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمے ہے، اور درحقیقت آخرت اور دنیا دونوں کے
ہم ہی مالک ہیں، پس میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے، بھڑکتی ہوئی آگ سے اس میں
نہیں جھلسے گا مگر وہ انتہائی بدبخت جس نے جھٹلایا، اور منہ پھیرا، اور اس سے
دور رکھا جائے گا، وہ نہایت پرہیزگار، جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے

(وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى) اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے، جس کا بدلہ اُسے
دینا ہو، وہ تو صرف اپنے رب برتر کی رضاجوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے، اور
ضرور وہ (اس سے) خوش ہوگا"۔ (سورۃ الیل ۹۲۔ رکوع ۱)

تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ
نہ کرو جنھیں تم عزیز رکھتے ہو، اور جو کچھ تم کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا"۔
(سورۃ آل عمران۔ ۳۔ رکوع ۱۰)

ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولؐ پر اور خرچ کرو اُن چیزوں میں سے جن پر
اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے...... آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ
نہیں کرتے، حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔ (سورۃ الحدید ۵۷، رکوع ۱)

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو،
احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے (سورۃ البقرہ ۲ رکوع ۲۴)

وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنا مال محض لوگوں کو دکھانے کے لیے
خرچ کرتے ہیں، اور درحقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روز آخرت پر۔
سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہو، اسے بہت ہی بری رفاقت میسر آئی، آخر
ان لوگوں پر کیا آفت آجاتی، اگر یہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے، اور جو کچھ
اللہ نے دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے، اگر یہ ایسا کرتے تو اللہ سے ان کی نیکی
کا حال چھپا نہ رہ جاتا۔ (سورۃ النساء ۴ رکوع ۶)

یہ تمھاری دولت اور تمھاری اولاد نہیں ہے، جو تمھیں ہم سے قریب کرتی ہو
ہاں، مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ (سورہ سبا ۳۴۔ رکوع ۵)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو کچھ مال متاع ہم نے تم کو بخشا ہے، اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آئے، جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی نہ دوستی کام آئے گی، اور نہ سفارش چلے گی، اور ظالم اصل میں وہی ہیں جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔ (سورۃ البقرہ ۲ - رکوع ۳۴)

متذکرہ بالا آیات سے "کیوں" کا جواب یہ ملتا ہے کہ صدقہ دینے کا مقصد اپنے رب برتر کی رضا جوئی حاصل کرنی، اور اپنے کو پاکیزہ بنانا ہے، اور نتیجتاً روزِ آخر بھڑکتی ہوئی آگ میں جھلسنے سے اپنے کو بچانا ہے، جو مال اللہ کی راہ میں اللہ کی رضا جوئی اور پاکیزگی کی خاطر خرچ کیا جاتا ہے، اُسے خدا نے "قرضِ حسن" سے موسوم کیا ہے۔ ارشاد ہے :-

"تم میں کون ہے، جو اللہ کو قرضِ حسن دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے، (مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً) گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے، اور بڑھانا بھی، اور اسی کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔ (سورۃ البقرہ ۲ - رکوع ۳۲)

قرضِ حسن کا لفظی ترجمہ اچھا قرض ہے، یعنی ایسا قرض جو نیکی کے جذبے سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے، اس لیے جو مال راہِ خدا میں خرچ کیا جاتا ہے اسے خدائے تعالےٰ "قرضِ حسن" قرار دیتا ہے، اور وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل ادا کروں گا، بلکہ اس سے کئی گنا بڑھا چڑھا کر زیادہ دوں گا۔ البتہ شرط یہ رکھی گئی ہے کہ وہ قرض اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے نہ دیا جائے، بلکہ صرف اللہ کی رضا جوئی کی خاطر اُن کاموں میں خرچ کیا جائے، جسے وہ پسند کرتا ہے، "قرضِ حسن" کے متعلق قرآن کی دوسری سورتوں میں ارشاد ہے :

"کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض، تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر

واپس دے، اور اس کے لیے بہترین اجر ہے۔ (سورۃ الحدید ۵۷ - رکوع ۲)

پس جتنا قرآن بہ آسانی پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو (وَاَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا)، جو کچھ بھلائی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے اُسے اللہ کے یہاں موجود پاؤ گے، وہی زیادہ بہتر ہے، اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔" (سورۃ المزمل ۷۳ - رکوع ۲)

قرضِ حسن" پر "منثور" میں ایک حدیث اس طرح درج ہے کہ :-

"اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں۔ اے آدمی، اپنا خزانہ میرے پاس امانت رکھ دے نہ اس میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے، نہ غرق ہونے کا، نہ چوری کا، میں ایسے وقت میں وہ تجھ کو پورا پورا واپس کروں گا، جس وقت تجھے اس کی انتہائی ضرورت ہوگی، (بحوالہ "فضائلِ صدقات" - حصہ اول)

کتنا اور کیوں کے بعد سوال آتا ہے، کہ خیرات میں کیسی چیزیں دی جائیں اس پر بھی قرآن میں بہت صریح احکام وارد ہوئے ہیں :-

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمھارے لئے نکالا ہے، اس میں سے بہتر حصہ راہِ خدا میں خرچ کرو، ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لیے بُری سے بُری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو، حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمھیں دے تو تم ہرگز اسے لینا گوارا نہ کرو گے۔ الّا یہ کہ اس کو قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ، تمھیں جان لینا چاہیے کہ اللہ بے نیاز ہے، اور بہترین صفات سے متصف ہے۔ شیطان تمھیں مفلسی سے ڈراتا ہے، اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اللہ تمھیں اپنی بخشش اور فضل کی

امید دلاتا ہے، اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے" (سورۃ البقرۃ ۲، رکوع ۳۷)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مالی قربانیاں انہی سارے احکامات کی بجاآوری تھیں، ان کی مالی قربانیوں میں حضرت ابوبکرؓ کی مالی قربانیاں اپنی مثال آپ ہیں جن پر بہت سی روایات منقول ہیں، جن میں کچھ کا ذکر بعد میں آئے گا۔

اقبالؔ کا اگر سارا اردو کلام مدحت رسولؐ ہے تو انھوں نے اپنی مختلف نظموں اور غزلوں اور رباعیوں میں صحابہ کرامؓ کے اوصاف حمیدہ پر نذرانۂ عقیدت پیش کرنا بھی ضروری سمجھا کیونکہ خدا اور رسول کے بعد صحابہ کرامؓ پر ایمان لانا اور ان کی تقلید کرنی بھی ایمان کا جزو ہے، اقبال نے صحابہ کرامؓ میں خصوصی نظمیں صرف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ پر رقم کی ہیں، نظم "صدیقؓ" میں اقبالؔ نے حضرت ابوبکرؓ کی مالی قربانیوں کو مثلاً پیش کیا ہے، اس لیے کہ آپؓ کی مالی قربانیوں پر درج ذیل مشہور حدیث منقول ہے، اور اقبالؔ نے اس نظم میں اسی حدیث کو منظوم کیا ہے،

"حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدسؐ نے صدقہ کرنے کا حکم فرمایا، اتفاقاً اس زمانے میں میرے پاس کچھ مال موجود تھا، میں نے کہا آج میرے پاس اتفاق سے مال موجود ہے، اگر میں ابوبکرؓ سے کچھ بھی بڑھ سکتا ہوں تو آج بڑھ جاؤں گا، یہ سوچ کر خوشی خوشی میں گھر گیا، اور جو کچھ بھی گھر میں رکھا تھا اس میں سے آدھا لے آیا، حضورؐ نے فرمایا۔ آخر کیا چھوڑا؟ میں نے عرض کیا۔ آدھا چھوڑ آیا ہوں، اور حضرت ابوبکر صدیقؓ جو کچھ رکھا تھا، سب لے آئے، حضرتؐ نے فرمایا۔ ابوبکر! گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا۔ انھوں نے فرمایا۔ ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا یعنی اللہ اور اس کے رسول پاکؐ کی برکت اور ان کی رضا اور

خوشنودی کو چھوڑ آیا، حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا۔ "میں حضرت ابوبکرؓ سے کبھی نہیں بڑھ سکتا"۔

یہ قصہ غزوۂ تبوک کا ہے، اس وقت حضور اکرمؐ نے چندے کی خاص طور سے ترغیب فرمائی تھی، اور صحابہ کرامؓ نے اپنے اپنے حوصلوں بلکہ ہمت و وسعت سے زیادہ اعانتیں فرمائیں، جہاں تک حضرت ابوبکرؓ کی مالی قربانیوں اور عطیات کا سوال ہے، ابن جوزی کہتے ہیں کہ اس بات پر مفسرین اور فقہا کا اتفاق ہے، کہ سورۃ الیل ۹۲ رکوع ۱ درج ذیل آیات آپؓ کی شان میں نازل ہوئیں۔

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى (١٧) الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى (١٨)

(اور اس دھدکتی ہوئی آگ سے) دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے"۔

حضرت ابوہریرہؓ حضور اقدسؐ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ۔ مجھے کسی کے مال نے اتنا نفع نہیں دیا جتنا ابوبکرؓ کے مال نے دیا"۔ حضورؐ کا یہ ارشاد سن کر حضرت ابوبکرؓ رونے لگے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ، کیا میں اور میرا مال آپؐ کے سوا کسی اور کا ہے، حضورؐ کا یہ ارشاد بہت سے صحابہ کرامؓ سے بہت سی روایات میں نقل کیا گیا ہے، حضرت سعید بن مسیبؓ کی روایت میں اس کے بعد یہ درج ہے کہ حضور اقدسؐ حضرت ابوبکرؓ کے مال میں اسی طرح تصرف فرماتے تھے، جس طرح اپنے مال میں فرماتے تھے، حضرت عروہؓ کہتے ہیں کہ جس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ مسلمان ہوئے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے جو سب حضورؐ کے اوپر خرچ کر دئے (یعنی حضورؐ کی خوشنودی میں)، ایک اور حدیث میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ۔

"کوئی شخص ایسا نہیں ہے، جس کا مجھ پر احسان ہو، اور میں نے اس کے احسان کا بدلہ نہ دے دیا ہو، ابوبکر رضؓ کا احسان میرے ذمے ہے (جس کا بدلہ نہ دے سکا) حق تعالیٰ شانہ' خود ہی قیامت کے دن اُس کے احسانوں کا بدلہ عطا فرمائیں گے، مجھے کسی کے مال نے اتنا نفع نہیں دیا جتنا ابوبکر رضؓ کے مال نے نفع دیا۔" تاریخ الخلفاء' بحوالہ فضائل صدقات"۔ حصہ اوّل)

اقبالؒ کا اپنی شاعری میں سارا مطمح نظر مسلمانوں کے ایمان کو تر وتازہ کرنا اور انھیں مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا تھا، چنانچہ متذکرہ بالا روایات کے پیشِ نظر انھوں نے خیرات و صدقات کے معاملے میں حضرت ابوبکر رضؓ کی مثال مسلمانوں کے سامنے پیش کی۔ ان کی درج ذیل نظم "صدیق رضؓ" متذکرہ بالا حدیث بہ سلسلۂ غزوۂ تبوک (رجب ۹ھ مطابق نومبر ۶۳۰ء) کی ہو بہو تلمیح ہے۔

اک دن رسولِ پاکؐ نے اصحاب سے کہا
دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار

ارشاد سُن کے فرطِ طرب سے عمر رضؓ اُٹھے
اس روز اُن کے پاس تھے درہم کئی ہزار

دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیق رضؓ سے ضرور
بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار

لائے غرض کہ مال رسولِ امیںؐ کے پاس
ایثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار

پوچھا حضور سرورِ عالمؐ نے اے عمر رضؓ!
اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار

رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟
مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار

کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملّتِ بیضا پہ ہے نثار

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار

لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت
ہر چیز، جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار

مِلکِ یمین و درہم و دینار و رخت و جنس
اسپِ قمر سُم و شتر و قاطر و حمار

بولے حضورؐ چاہیے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیق رضؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس!

(بانگِ درا)

اقبالؒ نے اس نظم کا عنوان "صدیق رضؓ" اس لیے رکھا چونکہ مکہ والوں نے حضرت ابوبکر رضؓ کو "صدیق" کا لقب دے رکھا تھا، عربی زبان میں "صدیق" کے معنی سچے اور سراپا راستباز انسان کے ہیں، جیسے سورہ یوسف ۱۲، رکوع ۶ میں ارشاد ہے۔

"یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ" یوسف! اے سراپا راستی!

اقبالؒ نے اس نظم کے پہلے شعر میں یہ کہہ کر کہ ع دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار ان قرآنی آیات کی طرف خیال مبذول کرایا جو صدقہ و خیرات پر وارد ہوئی ہیں، جن میں کتنا کیوں اور کیسا پر چند آیات پہلے گذر چکی ہیں، مگر اقبالؒ کے اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے چند اور آیات نیچے نقل کی جارہی ہیں جن سے صدقہ و خیرات کے فضائل اور ان کے نتائج پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

راہِ خیر میں جو مال تم خرچ کرتے ہو وہ تمھارے اپنے لیے بھلا ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو، تو جو کچھ مال تم راہِ خیر میں خرچ کرو گے، اس کا پورا اجر تمھیں دیا جائے گا، اور تمھاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔"
(سورۃ البقرہ ۲، رکوع ۳۷)

جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے، اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں، اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے، افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی، جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے، نہ دکھ دیتے ہیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، اور ان کے لئے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے ایمان لانے والو، اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے، اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے، نہ آخرت پر ۔ ۔ ۔ ۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے دل کے پورے ثبات و اقرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو۔ (سورۃ البقرہ ۲، رکوع ۳۶)

" اگر اپنے صدقات اعلانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپ کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے، تمھاری بہت سی برائیاں اس طرز عمل سے محو ہو جاتی ہیں:" (سورۃ البقرہ ۲ - رکوع ۳۷)

دردناک سزا کی خوشخبری دے دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں، اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی، اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا، یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا

لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔ (سورۃ التوبہ ۹۔ رکوع ۵)

شاید اقبال کے ذہن میں "سورۃ التوبہ ۹" کی متذکرہ بالا آیات ہی تھیں کہ بالکل آخری عمر میں جھنجھلاہٹ میں اُن سے یہاں تک کہلوا ڈالا۔ ؎

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے ۔۔۔ ہے اِن کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

"ضرب کلیم"

بخل اور کنجوسی پر "مشکوٰۃ" میں یہ روایت منقول ہے کہ فرمایا رسول اللہ ؐ نے "دو خصلتیں ایسی ہیں کہ وہ مومن میں جمع نہیں ہو سکتیں، ایک تو بخل، دوسری بد خلقی"۔

اس نظم "صدیقؓ" میں حضرت ابو بکرؓ کی مالی قربانیوں کے ذکر کے ساتھ اقبال نے آخری بند کے پہلے شعر میں آپ کی رسول اللہ ؐ سے رفاقت اور عشق و محبت کا بھی ذکر کیا ہے، کیونکہ اگر آپؓ کی مالی قربانیاں مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں، تو ایسے وقت میں جب کہ مکہ میں اسلام کا نام لینا اپنی جان سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا، حضرت ابو بکرؓ کا رسول ؐ کی رفاقت کرنی بھی اپنی مثال آپ ہے، اس شعر میں جس رفاقت اور رازداری کی باتیں کی گئی ہیں، وہ ترجمان ہیں درج ذیل آیات کی :۔

" اے ایمان لانے والو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم نے اگر نبی ؐ کی مدد نہ کی تو کچھ پروا نہیں، اللہ اُس کی مدد اس وقت کر چکا ہے، جب کافروں نے اُسے نکال دیا تھا، جب وہ (محمد ؐ) صرف دو (محمد ؐ اور ابو بکرؓ) میں کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں چھپے، جب وہ (محمد ؐ) اپنے ساتھی (ابو بکرؓ) سے کہہ رہا تھا، کہ "غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ (لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا) اس وقت اللہ نے اُس پر اپنی طرف سے سکون قلب

نازل کیا، اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے، اور کافروں کا بول نیچا کر دیا، اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے، اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے، نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ یہ تمھارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ (سورۃ التوبہ ۹ - رکوع ۶)

ان آیات کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے اس وقت سے ہے، جب مکہ میں دعوت حق زور پکڑ گئی تو کافروں نے ایک جلسہ کیا، اور بہت سے مشوروں میں ابوجہل کا یہ مشورہ طے پایا کہ آج رات محمد ﷺ کو قتل کر دیا جائے اور اگر قتل کیا جانا ممکن نہ ہو تو گرفتار کر لیا جائے جس پر سو اونٹ کے انعام کا اعلان بھی کیا گیا۔ ان باتوں کی خبر، بذریعہ وحی، رسول اللہ ﷺ کو ہو گئی، اور اس کا ذکر آپؐ نے صرف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ سے کیا، اُس رات آپؐ نے اپنے حجرے میں حضرت علیؓ کو اپنی جگہ سلا دیا، اور مکان کے باہر حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ نکلے، حالانکہ آپؐ کے مکان کا محاصرہ اس وقت تک کیا جا چکا تھا، مگر سبھوں کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے اس لیے کہ آنحضرت نے ایک مشتِ خاک پر سورۃ یٰسٓ ۳۶ کی اوّل آیات لَا یُبْصِرُوْنَ تک پڑھ کر اُن کے سروں پر ڈال دیا تھا، یہ دونوں ایک غار میں، جو جبلِ ثور میں تھا چھپ گئے، اور تین دن اور رات اس میں چھپے رہے حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ آپ دونوں کو روزانہ چھپ کر کھانا دے جاتیں، اور آپؓ کا نوکر عامر بن فہیرہ روزانہ بکریاں چرانے کے بہانے رات کو وہاں بکریوں کے ساتھ رہ جاتا تاکہ ان کو دودھ دے سکے۔

غار ثور میں تین دن اور رات رفاقت کے بعد دونوں دو اونٹ پر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے، سراقہ بن مالک ابن جعشم جس نے انعام کی لالچ میں آپؐ کے گرفتار کرنے کا وعدہ کر لیا تھا، آپؐ کا تعاقب کرتا ہوا راستہ میں آگیا۔ آنحضرتؐ نے بد دعا کی اور اس کے گھوڑے کے

چاروں پاؤں زمین میں دھنس گئے، سراقہ نے مجبور ہو کر آنحضرت ﷺ سے امان مانگی، اور آپ ﷺ نے اس کو امان دی، سراقہ وہیں سے لوٹا، اور راستہ میں جو بھی آپ ﷺ کے تعاقب کو جا رہا تھا، اسے لوٹاتا گیا۔

حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ سے ہجرت کی اور حضرت ابوبکرؓ نے ان کی رفاقت کا فیصلہ کیا، تو آپؓ نے اپنا تمام مال جو ان کے پاس تھا لادا، ان کے ساتھ کل مال پانچ چھ ہزار درہم تھا، اس کو لے کر آپؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غارِ ثور چلے گئے، حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ آپؓ کے اس فعل پر اُن کے دادا حضرت ابو قحافہؓ نے (جو بعد میں مسلمان ہوئے) کہا کہ ابوبکر تم سب کو اپنا مال اور اپنی ذات سمیت مبتلائے مصیبت کر گیا ہے، اسماءؓ کہتی ہیں، کہ میں نے کہا۔ "اے میرے دادا جان! ہرگز ایسا نہیں ہے، وہ تو ہم لوگوں کے لیے خیر کثیر چھوڑ گئے ہیں"۔ حالانکہ خدا کی قسم انھوں نے ہمارے لیے کچھ نہیں چھوڑا تھا۔

غار ثور سے مدینہ جاتے وقت حضرت ابوبکرؓ نے کل مال جو تخمیناً چھ ہزار درہم تھا، اپنے ہمراہ لے لیا تھا، یہ تھے وہ "رفیق نبوت" اور "عشق و محبت کے راز دار" جنھوں نے صرف اللہ کی رضا جوئی اور رسول ﷺ کی خاطر اپنی جان اور مال سے جہاد کیا، جہاد فی سبیل اللہ میں آپؓ کے خرچ کرنے کا یہ عالم تھا کہ روایت ہے کہ آپؓ مکہ میں رقم ادا کر کے غلاموں کو آزاد کراتے تھے ان کے اس فعل پر ان کے والد نے ان سے کہا کہ "بیٹا میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور لوگوں کو آزاد کرا رہے ہو، اگر مضبوط جوانوں کی آزادی پر تم یہ رقم خرچ کرتے تو وہ تمھارے لیے قوت بازو بنتے"۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا۔ ابا جان! میں تو وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے یہاں ہے۔

غزوۂ تبوک کے سلسلے میں جب رسول اللہ ﷺ کی اپیل پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنا سارا مال

آپؐ کے سامنے پیش کر دیا تو آپؐ کا پہلے حضرت عمرؓ سے یہ دریافت کرنا کہ ؎

رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟ مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار

اور پھر حضرت ابوبکرؓ کو یہ تاکید کرنی کہ اے پورے حضورؐ چاہیے فکرِ عیال بھی، تو ان سوالات سے حضور اقدسؐ درج ذیل آیت کی یاد دلا رہے تھے کہ

لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتہ داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو، اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہوگا۔ (سورۃ البقرہ ۲ آیت ۲۱۵)

حضور اقدسؐ کی متذکرہ بالا تاکید پر حضرت ابوبکرؓ کا یہ عرض کرنا کہ ؎

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

اس نظم صدیق کا کلیدی شعر ہے، قربان جائیے، اقبال کے تمثیلی پیرایۂ بیان پر۔ اس شعر کے پہلے مصرعہ کے پہلے ٹکڑے پر اقبالؒ نے درج ذیل حدیث کی تلمیح کی ہے، جسے ابوہریرہؓ نے روایت کیا ہے کہ فرمایا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے

"میری مثال اُس شخص کی سی ہے، جو آگ روشن کرے، اُس میں اِدھر اُدھر کے پروانے اور کیڑے اور مچھر آ کر گرنا شروع کریں۔ (تجرید صحیح بخاری شریف اردو نمبر شمار ۔ ۱۳۷۷)

مجموعی طور پر اقبالؒ نے اس شعر میں ترجمانی درج ذیل آیات کی کی ہے، جن ستونوں پر ایک مومن اپنے ایمان کی عمارت کھڑی کرتا ہے۔

اے نبیؐ، لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہاری خطاؤں سے درگزر

فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے، ان سے کہو کہ۔ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت قبول کرو، پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے، جو اس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔" (سورۃ آل عمران ۳۔ رکوع ۴)

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی، اور جو منہ موڑ گیا تو بہرحال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۱۱)

انہی آیات کی ترجمانی اقبالؒ نے "بانگِ درا" کی نظم "جوابِ شکوہ" کے اس شعر میں اس طرح کی ہے۔ ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

حضرت ابوبکرؓ نے اپنی جان و مال سے ایسے نازک وقت میں جہاد کیا جب کلمہ گویوں کی جان کے لالے پڑ رہے تھے، مگر ان کی یہ ساری قربانیاں اس عظیم الشان کامیابی کی خواہشمند تھی، جس کا وعدہ خدا نے رسولؐ کے رفاقت کاروں سے کیا ہے کہ

رسولؐ نے اور ان لوگوں نے جو رسولؐ کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی جان اور مال سے جہاد کیا، اور اب ساری بھلائیاں انہی کے لیے ہیں، اور وہی فلاح پانے والے ہیں، اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ بنا رکھے ہیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں، اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ ہے عظیم الشان کامیابی (سورۃ التوبہ ۹ رکوع ۱۱)

حضرت عائشہؓ سے یہ روایت منقول ہے کہ حضرت ابوبکرؓ وفات پا گئے، نہ کوئی دینار چھوڑا، اور نہ کوئی درہم، اور اس سے پہلے بیت المال سے حق لیا تھا، اس کو بھی بیت المال میں

لوٹا دیا" (حیاتِ الصحابہؓ)

حضرت ابوبکرؓ کی مالی قربانیوں پر ایک اور روایت اقبال کی اس نظم اور اس مضمون کی مقصدیت پر شاید ان مسلمان کے ذہنوں میں کچھ ہلچل ڈال سکے جن کے سونے افرنگی اور قالین ایرانی ہیں، جب اقبال یہ کہتے ہیں کہ یہ سماں اَلْفَقْرُ فَخْرِی کا رہا شانِ امارت میں تو ان کے ذہن میں جہاں رسول اللہؐ اور سارے صحابۂ کرامؓ کی زندگیاں پیشِ نظر رہی ہوں گی، وہاں حضرت ابوبکرؓ کے خلیفۃ الاسلام کے منصب جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد کی درج ذیل روایت بھی شامل ہوگی۔

حضرت عطاؒ بن سائب فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ سے بیعت کی گئی، صبح ہی صبح اپنے بازو پر چادریں لاد کر آپؓ بازار جا رہے تھے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کہاں کا ارادہ فرمایا؟ جواب دیا۔ بازار کا۔ حضرت عمرؓ نے کہا وہاں آپ کیا کریں گے؟ آپؓ تو مسلمانوں کے خلیفہ ہوئے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا۔ میں اپنے بال بچوں کو کہاں سے کھلاؤں گا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ آپؓ تشریف لے چلئے۔ آپ کے لیے حضرت ابوعبیدہؓ وظیفہ مقرر کر دیں گے۔ چنانچہ دونوں حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس آئے، انھوںؓ نے کہا۔ میں آپ کے لیے مہاجرین کے ایک درمیانی درجے کے آدمی کے برابر روزینہ مقرر کرتا ہوں، اور سردی اور گرمی کا لباس، جب اِن میں سے کوئی بوسیدہ ہو جائے آپ اُسے لوٹا دیجئے اور اُس کی جگہ دوسرا لیجئے۔ چنانچہ انھوں نے آپؓ کے لیے روزینہ میں آدھی بکری اور ایک چادر جو سر پر اوڑھی جائے اور ایک تہ بند جو پیٹ پر باندھا جائے، مقرر کیا۔ (بحوالہ حیات الصحابہؓ)،

صحابہ کرامؓ کے ان جانی و مالی قربانیوں پر حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اس بات پر بیعت لی تھی کہ ہم چستی اور سستی ہر حال میں سمع و طاعت پر قائم رہیں گے، خوشحالی اور تنگ حالی دونوں حالتوں میں راہِ خدا میں خرچ کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے منع کریں گے، اللہ کی خاطر حق کی بات کہیں گے اور اس معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔" (مسند احمد)

اقبال نے اتنی بڑی نظم "صدیقؓ" صرف ایک روایت (بہ سلسلۂ غزوۂ تبوک) اس لئے قلم کی چونکہ وہ مسلمانوں کے اذہان کو اس معاشی نظام کی طرف مبذول کرانا چاہتے تھے، جو دینِ اسلام کی روح ہے، اقبال اس معاشی نظام سے نالاں تھے، جو مغربی سامراجیوں اور مفکرین نے دنیا پر مسلط کر رکھا تھا، جس کے شکار زیادہ تر مسلمان تھے، جب ۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی انقلاب ہوا تو اقبال نے ٹھنڈی سانس لی کہ اب اس فرسودہ معاشی نظام کی بیخ کنی کا وقت آگیا ہے، اقبال اشتراکیت کے حامی نہیں تھے، اور نہ کوئی مسلمان ہو سکتا ہے، کیونکہ اس کی اساس ہی لادینیت پر قائم ہے، چنانچہ اس روسی انقلاب کی وجہ سے بدلتے ہوئے حالات میں اقبال نے مسلمانوں کو پھر اسی معاشی نظام کی یاد دلائی ہے، جو اس مضمون کا عنوان ہے،

جو حرف "قُلِ العَفْو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

(ضربِ کلیم۔ اشتراکیت)

اس مضمون کو اقبال کے اس شعر پر ختم کرنا زیادہ مناسب ہوگا جو ان سارے تذکروں کا لب لباب ہے، ؎

یہ مال یہ دولت، دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں! لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

(ضربِ کلیم۔ لا الٰہ الا اللہ)

کشمیر میں اسلامی ثقافت کے تاریخی مراحل

از ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، گورنمنٹ ڈگری کالج نواکدل سرینگر، کشمیر،

(۳)

اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت امیر کبیر کی خانقاہ کو بڑی مرکزیت حاصل تھی جس کو میر شمس الدین عراقی نے تطہیر و تجدید کے نام پر منہدم کرا دیا تھا، مگر دو سال تک اس کی نئی تعمیر کی طرف توجہ نہیں کی گئی، تو سلطان محمد شاہ کی بیوی کاکا محمد نے اپنے زیورات بیچ کر اس کی نئی تعمیر کرائی" وہ حضرت شیخ اسماعیل کبروی کی ارادت مند تھیں، حضرت شیخ کے دوسری خانقاہوں کو بھی یہی حیثیت و اہمیت حاصل ہوئی، اب اس دور کے مدارس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مدرسہ ملا رضی الدین | رضی الدین چک دور کے جلیل القدر عالم تھے، آخری شاہ میری دور میں وہ مدرسۂ سلطان قطب الدین کے سرکردہ اساتذہ میں گنے جاتے تھے، نامور کشمیری فضلا اُن سے مستفید ہوئے تھے، جس میں شیخ یعقوب صرفی، محدث شمس الدین پال اور علامہ داؤد خاکیؒ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ مولانا مفتی فیروز شہید ان کے داماد تھے، جو علامہ ابن حجر مکی سے حدیث میں اجازت و سند حاصل کر چکے تھے، سیاسی بدنظمی کے زمانے میں وہ گھر میں ہی درس دیتے تھے، ان کے علم و فضل کے بارے میں اعظمی لکھتے ہیں۔

"وقت کے متبحر عالم تھے، اور عقلی و نقلی علوم کے جامع ...... اکثر فنون میں کتابیں لکھی ہیں"[۱]

[۱] اعظمی۔ ص ۹۰ نیز دیکھئے نزہتہ الخواطر ج ۴ ص ۱۱۵ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۶۵۔

کو صاحب تالیف ہونے کے باوجود آج ان کی ایک تالیف بھی موجود نہیں ہے، تاہم انکے چند ممتاز شاگردوں کی کتابیں ہی ان کے فضل و کمال کا بین ثبوت ہیں،

مدرسہ ملا بصیر | ملا بصیر، حافظ رضی الدین کے معاصر تھے، وہ مادر زاد نابینا تھے، مگر بصیرت ایسی پائی تھی کہ بقول شیخ یعقوب صرفی ہزار ہا ہزار طلبہ ان سے مستفید ہوئے، اپنی منظوم کتاب مغازی النبی میں صرفی فرماتے ہیں۔[۱]

چو گویم ز حافظ بصیری کہ بود ... خبر داد اسرار کشف و شہود

رضی و بہ از او ہزاراں ہزار ... بشاگردیش داشتند افتخار

اگرچہ نبودست بینا بچشم ... ز خود ظاہرا بود اعمی بچشم

ولی از کمال حضور خدا ... دلش بود بینا بنور خدا

از و علم صوفیہ آموختم ... دقیقات عقلیہ اندوختم

فن منطق و اصطلاح کلام ... بدیع و بیان و معانی تمام

عقائد میں "تفضیل" طرف جھکاؤ رکھنے کی بنا پر بعض حلقوں میں شیعیت سے متہم تھے، جس کی مورخ اعظمی نے صاف الفاظ میں تردید کی ہے۔

"اُن کا دامن لوگوں کی افواہوں سے پاک و صاف تھا"[۲]

چک حکومت کا خاتمہ، اور کشمیر پر مغلوں کا تسلط، | جس زمانے میں چک حکمران نوربخشی امراء اور مبلغین کشمیر میں ایرانی امامت و ثقافت کی ترویج و اشاعت میں مصروف تھے اسی دور میں کشمیر کی سرحدوں پر مسلمانوں کی ایک عظیم الشان سلطنت مستحکم ہو رہی تھی۔ جلال الدین اکبر اپنی توسیع پسندی سے چھوٹی چھوٹی خود مختار مملکتوں کو مرعوب کر رہا تھا۔

[۱] مغازی النبی، مطبع محمدی لاہور ۱۳۱۷ھ [۲] تاریخ اعظمی مطبع محمدی لاہور ۱۳۰۳ھ ص ۸۵

اس نے اپنے ایجنٹ کشمیر بھی بھیج دیئے تھے، جو یہاں فضا مکدر کر کے بیرونی مداخلت کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے، اسی زمانے میں غازی چک مرگیا، اور اس کا بیٹا حسین شاہ تخت نشین ہوا، اس نے بدلتے ہوئے حالات کا صحیح اندازہ لگاتے ہوئے اپنی سیاسی حکمتِ عملی بدل دی، اس مقصد کے لیے حسین شاہ نے سنی مسلمانوں کو خوش کرنے کو ترجیح دی جن پر مملکت کا داخلی امن و سکون منحصر تھا، اس نے شیخ حبیب اللہ کو شیخ الاسلام مقرر کیا، ایک شاندار مدرسے کی تعمیر کی، صوفیہ اور علماء سے حسن سلوک کیا، مختلف طبقوں کے مسائل جاننے اور ان کو حل کرنے کے لیے مخصوص اوقات مقرر کیے۔ . . .

یہ سب مثبت اقدام تھے، جن کا مقصد کشمیر میں امن و اطمینان قائم کر کے بیرونی خطرے کو ٹالنا تھا، مگر چونکہ حسین شاہ خود بھی نوربخشی عقائد کا پیرو تھا، اور نوربخشی مبلغوں کی گرفت میں بھی تھا، اس لیے اس کی اصلاحی کوششیں بارآور نہیں ہوئیں، نوربخشی مبلغ سنی علماء اور مشائخ کی تذلیل و توہین کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے، چنانچہ ایک دن ایک نوربخشی شخص نے شیخ الاسلام مولانا حبیب اللہ پر چھپ کر حملہ کیا، وہ شدید زخمی ہوئے، یہاں تک کہ تلوار کی کاٹ سے ان کی انگلیاں بھی گر گئیں، شیخ الاسلام پر اس قاتلانہ حملہ سے مولانا مفتی فیروز اور مولانا شمس الدین الماس سے فتویٰ حاصل کیا گیا، انھوں نے گستاخ قاتل کو مباح الدم ٹھہرایا، چنانچہ قاتل کو قتل کیا گیا، حسین چک نے ملک میں فرقہ واریت کی آگ پھیلنے کے خوف سے پہلے اپنے مذہبی تعصب کو ظاہر نہیں ہونے دیا، مگر کچھ دنوں کے بعد نوربخشی مبلغوں کے زیر اثر وہ ان علماء سے بدلہ لینے پر آمادہ ہوا، مولانا فیروز اور شیخ الماس شہید کیے گئے، اس سے پوری مملکت میں نفرت کی آگ پھیل گئی، حسین شاہ نے حالات سدھارنے کی پھر کوشش کی، مگر ناکام ہوا، اکبر کے ایجنٹوں نے اس عمومی نفرت سے فائدہ اٹھایا، ۹۷۰ھ ۱۵۶۰ء میں حسین شاہ چک مرگیا اور اب اس کا بھائی علی شاہ تخت نشین ہوا، اس نے اکبر کے نام خطبہ پڑھا اور سکہ جاری کیا، اس طرح پہلی مرتبہ عملاً اکبر کی سیادت قبول کی، وہ سنی مذہب کا پیرو اور مشائخ

اہلسنت کا عقیدتمند تھا، وہ بڑا دیندار صوم و صلوٰۃ کا پابند اور دینی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا، ایک دن وہ حسبِ معمول چوگان کھیلنے گیا تو اچانک گھوڑے سے گرگیا، اور محل میں پہنچتے ہی انتقال کر گیا۔[1]

علی شاہ کے بعد جو لوگ حکومت کے امیدوار تھے، ان میں کا اس کا بیٹا یوسف شاہ چک اور دوسرا اس کا بھتیجا یوسف خان (پسر حسین شاہ چک)، سرفہرست تھے، یوسف شاہ چک عیش و طرب کا متوالا، ساز سنگیت کا ماہر اور امور مملکت سے ناواقف تھا، جب کہ یوسف خاں بڑا بہادر اور باحوصلہ نوجوان تھا، اسی نے مہرالنساء کی محبت کی راہ میں جہانگیر کے رقیب علی قلی خاں شیر افگن کا سر قلم کیا تھا۔[2] اور اس کے نتیجے میں جہانگیر کا منظور نظر بن گیا تھا، تاہم یوسف خاں نے کشمیر کی سیاست میں کوئی گہری دلچسپی ظاہر نہیں کی، کیونکہ اُسے طاقتور سلطنت مغلیہ میں کشمیر کا انضمام قریب نظر آرہا تھا، اس کے ایک قریبی ساتھی ملک حیدر چاڈورہ اپنی تاریخ کشمیر میں لکھتے ہیں :-

"یوسف خان فرزند حسین شاہ چک اپنی صواب دید اور عقل و فراست سے، پہلے ہی جان چکا ہے کہ اب کشمیر میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا مردہ کو پیٹنے کے برابر ہے،"[3]

اس طرح یوسف خاں کی بے رغبتی سے یوسف شاہ چک کشمیر کا بلا شرکت غیرے حکمران ہوا، مگر یوسف شاہ چک جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا فطرۃً عیش کوش اور چنگ و رباب کا دلدادہ تھا، شیعہ مؤرخ حیدر ملک چاڈورہ یوسف شاہ کے مزاج و مذاق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے،

. . . . باد نخوت دغرور پندار بکاخ دماغش راہ یافتہ ہیچکس را بنظر نیاورد و اکثر

---

[1] مآثر رحیمی ج اص، ۲۵ ؍۔ [2] بعض یورپی مصنفوں نے یہاں یوسف خاں (پسر حسین شاہ) سے یوسف شاہ چک (ولد علی شاہ) مراد لیا ہے، جو صحیح نہیں ہے، ملاحظہ ہو Persian literature, C.A. Storey, P 680 اور Rieu's Catalogue, vol I, P297
[3] تاریخ کشمیر (قلمی)

بازنان مغنیہ وقوالاں وکلاونتاں بسر می برد وازیں معنی خوف سیاست تکی از
خواطر اہالی وموالی بدر رفت[1]

یوسف شاہ چک کی غفلت شعاری اور عیش پرستی سے ملک کا نظم ونسق، جو پہلے ہی غیر مستحکم تھا، تیزی سے بگڑنے لگا، اس وقت مغل دربار میں کشمیر کے کچھ سربرآوردہ علماء اور ارباب سیاست موجود تھے، اور مغلوں کی مداخلت کے خواہشمند تھے، یوسف شاہ چک نے اپنا اقتدار قائم رکھنے اور ساتھ ہی مغلوں سے مخاصمت مول نہ لینے کی کوشش کی، مگر اس کے بعد اس نے یہ غیر دانشمندانہ طریقہ اختیار کیا کہ کشمیر میں اپنے سیاسی حریفوں کو مغلوب کرنے کیلئے اکبر سے فوجی امداد کی درخواست کی۔ اکبر نے جو پہلے سے مناسب وقت کا منتظر تھا، ایک لشکر جرار کشمیر کی طرف روانہ کیا، یوسف شاہ چک کو اپنی سیاسی حماقت اور اکبر کے اصلی عزائم کا احساس ہوا، اس نے اپنے استمداد کو کالعدم قرار دے کر کشمیر میں مغل فوج کا مقابلہ کرنے کیلئے زور وشور سے تیاری شروع کی، مغلوں نے اسے غداری سے تعبیر کیا، اور اپنی پیش قدمی جاری رکھی، یوسف شاہ نے کشمیر کے حدود پر حملہ آور فوج کو کچھ نقصان پہنچایا، مگر جب اسے مسلح اور مستعد لشکر جرار کے آگے اپنی شکست کا یقین ہوا، تو اس نے مان سنگھ کی صلح کی پیش کش قبول کی، مان سنگھ نے اسے جان کی امان کا یقین دے کر دربار اکبری میں پہنچایا، اور وہاں اکبر نے اسے وطن سے دور رہنے کا حکم سنایا،

یوسف شاہ چک گرفتار ہوا تو اس کے بیٹے یعقوب شاہ چک نے اپنے باپ کو مردہ قرار دے کر اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا، اس نے ایک طرف مغلوں سے ٹکر لینے کا ارادہ کیا، مگر دوسری طرف بھنگ خوری وشراب نوشی میں رات دن لت پت رہتا تھا، جب اسے بھی اپنے اقتدار کی کشتی مکمل طور پر ڈوبتی نظر آئی تو اس نے اپنے نئے اور پرانے حریفوں سے جلد جلد انتقام لینے

[1] تاریخ کشمیر (قلمی)

کا تہیہ کیا، ان میں علمائے اہلسنت والجماعت پیش پیش تھے، چنانچہ کشمیر میں کشت وخون اور خانہ جنگی کا بازار پھر گرم ہوا، یہ خونیں ڈرامہ اس وقت انتہا کو پہنچ گیا، جب یعقوب شاہ نے ایک مقتدر سیاسی اور مذہبی شخصیت قاضی موسیٰ سے انتقام لینے کا پختہ ارادہ کیا، ان کا "جرم" یہ تھا کہ انھوں نے سالہا سال پہلے یوسف شاہ چک کے ایک سیاسی حریف ابدال ماگرے کی لاش اس حالت میں میدان جنگ سے اٹھا کر محفوظ جگہ دفن کرائی تھی، جب یوسف شاہ نے اسے میدان جنگ ہی میں بے گور وکفن چھوڑ دیا تھا، یوسف شاہ نے اپنے عہد حکومت میں قاضی موسیٰ سے اس جرم کی پرسش نہیں کی تھی، مگر اب یعقوب شاہ نے اپنی انتقامی آگ اُن کے خون سے بجھانے کا عزم کیا، اس کے لئے اس نے ایک بھیکا سا نہ بہانہ ڈھونڈا، اس نے قاضی موسیٰ سے اذان میں علی ولی اللہ کا اضافہ کرنے کے جواز میں فتویٰ طلب کیا، قاضی صاحب نے نہ صرف اسے رد کر دیا بلکہ سرینگر کی جامع مسجد میں لوگوں کو نوربخشیوں کے عزائم سے آگاہ رہنے کی تلقین کی، یعقوب شاہ نے قاضی صاحب کو قتل کرنے کا حکم دیا، یہ شہادت اس سفاکی اور ظالمانہ طریقے پر عمل میں لائی گئی کہ اعتدال پسند شیعہ مورخوں نے بھی اس پر کھل کر اظہار افسوس کیا[1]، قاضی صاحب کی شہادت یعقوب شاہ کے محل اور مملکت کے لئے قہر الٰہی کا صاعقہ بن کر نازل ہوئی[2]، مغل فوج جو پہلے ہی سرحد پر موجود تھی، اور موسم ٹھیک ہونے کی منتظر تھی، کشمیر میں

[1] تاریخ بہارستان شاہی (قلمی)، تاریخ کشمیر ملک حیدر (قلمی)، [2] "در ہماں روز کہ قاضی بشہادر داخل شد چناں رعد وبرق پیدا شد کہ اکثر مردم ازاں ترس بے جان شدند، خصوصاً در خانہ یعقوب شاہ زن علی دار کہ دختر پادشاہ مذکور بود مع سہ وچہار کس مرد از آتش برق سوختند ومردم شہر از یعقوب شاہ متنفر شدند کہ حمات را بحمات اختیار کردہ خانمان خود گزاشتہ جابجا وسو بسو گریختند آخر از ہماں بلاد وقہر باد تند غوغے وقت خزاں آفتاب بمیزان رسید بجائے برگ ریزی درختاں از دم تیغ بے دریغ خونریزی آدمیان واقع شد" تاریخ کشمیر، ملک حیدر۔

داخل ہوئی، یعقوب شاہ نے کچھ دنوں تک چھپ چھپ کر بستیاں جلانے اور شبخوں مارنے سے
مغل فوج کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی مگر یہ ساری اچھل کود اس کی سراسیگی کا نتیجہ تھی،
اسے بہت جلد گرفتار کیا گیا، اور دربار اکبری کی طرف روانہ کیا گیا، وہاں اس کا باپ یوسف
شاہ چک پہلے ہی موجود تھا، اکبر نے باپ اور بیٹے دونوں کو بہار کی طرف جلاوطن کیا، جہاں انھوں نے
وقت موعود پر وفات پائی۔

مغلوں کے تسلط کے منفی اثرات | وسیع سلطنت مغلیہ کا ادنیٰ ساجزو بننے کے ساتھ ہی کشمیر جریدۂ
عالم پر اپنا علحدہ وجود کھو بیٹھا، جو ملک اب تک آزاد اور خود مختار رہا تھا، اب وہ لاہور میں مغلوں کے
متعین صوبیداروں کا ماتحت بن گیا ...... مغلوں نے جونہی کشمیر پر قبضہ جمایا تو انھوں نے
اسے پائیدار بنانے کے لئے تمام تدبیریں بروے کار لائیں، اکبر نے اپنی سطوت وصولت کی دھاک
بٹھانے کے لیے کوہ ماران کے اردگرد ایک ہیبت دیوار کھڑی کر دی، اس نے اپنے طویل دور حکومت
میں یہاں ایک علمی ادارہ بھی قائم نہیں کیا، مغلوں کے توسع اور آزاد خیالی سے کشمیر میں متضاد
اور مختلف فرقے ایک ساتھ پنپتے رہے، اور مغل حکمران یکساں طور پر ان کی ہمت افزائی کرتے تھے،
اس سے کشمیر میں فرقہ واریت کی جڑیں اکھڑنے کے بجاے، اور گہری ہوتی چلی گئیں، مغل حکمران تجربہ کار سیاست
دانوں کی طرح شیعہ اور سنی فتنہ پردازوں کی ایک ساتھ پشت پناہی کرتے تھے، اگر وہ ایک طرف
سنیوں کو اپنی داد رسی کا یقین دلاتے تھے، تو دوسری طرف ان پر شیعہ گورنروں کو مسلط کرتے
تھے، ان میں ظفر خان احسن کا نام قابل ذکر ہے، وہ سخت شیعہ تھا، مگر اس کے باوجود اسے
دو مرتبہ کشمیر کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اسی نے اپنی "مرکزی لابی" کی مدد سے مشہور صوفی اور مبلغ حضرت
خواجہ خاوند محمود نقشبندیؒ کو شاہجہاں کے حکم سے کشمیر سے نکلوایا،[1] انھیں پھر کبھی کشمیر آنے کا موقع
نہیں دیا گیا، یہاں تک کہ ان کا انتقال بھی کشمیر سے لاہور میں ہوا۔ مغل حکمرانوں پر شیعہ عالموں

[1] مولوی غلام سرور لاہوری ان کے مقام و مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔
پیش جلال الدین اکبر و جہانگیر و شاہجہان قبول عظیم یافت بحدیکہ بیگمات و مستورات شاہی

شاعروں اور سیاست گروں کی جو مضبوط گرفت تھی، اس سے کشمیر بھی بے حد متاثر ہوا، ان
لوگوں نے کھل کر کشمیر میں ایرانی فکر و ثقافت پھیلائی، ان میں مشہور شیعہ عالم میر فتح اللہ
شیرازی نے کشمیر میں ہی لمبی مدت گزار کر وفات پائی۔

اورنگزیبؒ کے فیوض | تاہم سلطان محی الدین اورنگزیبؒ عالمگیر کا دور اس کے اسلاف سے
مختلف تھا، وہ بذات خود اسلام پسند اور بے راہ روی کا مخالف تھا، جس کا کشمیر پر بھی اچھا
اثر پڑا۔ اس نے یہاں باغات کے بجائے مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کیں۔ جن میں اس زمانے
میں عبادت و ریاضت کے ساتھ ساتھ درس و تدریس اور تصنیف و تحقیق کی مجلسیں بھی
جمتی تھیں۔ کشمیر میں اورنگزیب کی بنائی ہوئی مسجدوں کی تعداد مورخ غلام حسن کے
مطابق پچپن ہے۔[1]

اسی طرح اس نے مخلص، متبحر اور دیندار علماء کی سرپرستی اور ہمت افزائی کی جس سے
ان کے حوصلے نہایت بلند ہوئے، اور انھوں نے آزادی سے کشمیر میں تعلیم اور
اصلاح معاشرہ کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان میں شیخ حیدر،
ملا حیدر، قاضی اور خواجہ معین الدین نقشبندی جیسے علما و شامل تھے، اورنگزیب نے
ملا حیدر کو قاضی خاں کا لقب دیا تھا، وہ فتاویٰ عالمگیری کے مرتبوں میں شامل تھے،
شیخ حیدر، حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کے تلمیذ رشید تھے، ان کی کوششوں
سے کشمیر میں علم حدیث کی تعلیم و تدریس کا ذوق پیدا ہوا۔ خواجہ معین الدین، خواجہ
خاوند محمود نقشبندیؒ کے نامور فرزند تھے، انھیں عالمگیر سے رشتہ بھی ہو گیا تھا،
خواجہ معین الدین صاحب نقشبندیؒ کی اہلیہ خواجہ عبد الرحیم دہ بیدی کی بیٹی تھیں، اور

[1] تاریخ حسن ج ۱ ص ۲۱۶

خواجہ وہ بیدی اورنگ زیب عالمگیر کے بہنوئی تھے، خواجہ معین الدین بلند پایہ عالم دین، صاحب قلم مصنف، مبلغ، مصلح اور مربر آوردہ روحانی پیشوا تھے، ان کے والد بزرگوار خواجہ خاوند محمود کو جو اصلاحی کام ظفر خان احسن کی سازش سے ادھورا چھوڑنا پڑا تھا۔ اسے انھوں نے انتہائی خوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ خواجہ معین الدین اورنگ زیب کی تجدید و اصلاح کی کوششوں کے زبردست مداح اور معترف تھے۔ انھوں نے اپنی ساری کتابیں جن میں قرآن حکیم کی دو تفسیریں بھی شامل ہیں، اورنگ زیب عالمگیر ہی کے نام سے منسوب کی ہیں، اپنے ایک فاضلانہ عربی رسالہ رد الملاحدہ میں وہ عالمگیر کو ان القاب سے یاد کرتے ہیں۔

المخدوم الاعظم صاحب السیف والقلم رافع

مراتب العلم الی غایۃ القصوی و دافع کلمۃ اھل

البدعۃ إلی الأرض السُّفلی المخصوص بالنفس

القدسیۃ المکرم بالریاسۃ الانسیۃ محی الدین

ابو المظفر محمد شاہ اورنگ زیب بہادر بادشاہ

عالمگیر خلد اللہ ملکہ و دولتہ"

اس دور کے ایک اور جلیل القدر عالم اور مدرس مولانا محمد امین گاگانی کشمیری[1] (م سنہ ۱۰۹۳ھ) اورنگ زیب کی اصلاحی اور تجدیدی خدمات کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان ہیں۔

در سما علا چو مہر منیر — شاہ اورنگ زیب عالمگیر

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند۔ مولوی رحمان علی مرحوم، لکھنؤ سنہ ۱۹۱۴ء ص ۱۸۲ - ۱۸۳ نیز تاریخ اعظمی - ص ۱۹۱ - ۱۹۲۔

در بساط زمیں خلیفۂ حق — بردہ ارث از خلافت مطلق

حامیِ شرع و سایۂ رحمٰن — مبدأ جود، منبع احسان

دیدۂ معرفت دلِ صافش — عین میزان عدل و انصافش

دہر را فضلِ اوست فصلِ بہار — جود او ابر لیک گوہر بار

نیک، بد لطف او قضای اجل — سہل از قہر او فنائی اجل

نور علم از بدایتش روشن — محو قہرش ہمہ ضلال و فتن

اوست ظلمات کفر را قامع — نور ایمان زروئے او لامع

اندریں خانقاہ مینا فام — دادہ آئین و رونق اسلام

برگزید از برائے اہل کمال — از کرامت مناصب اجلال

خوان جودی میان خلق نہادہ

طالباں را زاں وظائف داد[1]

(باقی)

---

[1] رسالہ فی اصول الحدیث (قلمی)، ملا محمد امین گاگانی کشمیری۔

ابن عطیہ اندلسی

جناب شیخ نذیر حسین صاحب، مدیر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،

اندلسی علماء نے علوم اسلامیہ کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، تفسیر، حدیث، ادب و تاریخ اور فقہ میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں، ان اکابر علماء میں خصوصیت سے قابل ذکر ابن عطیہ ہیں، جن کی تفسیر المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز اندلس اور المغرب (شمالی افریقہ کے ممالک) میں بڑی مقبول و متداول اور وہاں کے علمی حلقوں میں خاص قدر و منزلت کی حامل رہی ہے،

ابن عطیہ کا پورا نام ابو محمد عبد الحق بن ابو بکر غالب بن عبد الرحمان بن عطیہ ہے، ان کے آباو اجداد عربی النسل تھے، جن کا نسبی تعلق قبیلہ عدنان سے تھا، اسلامی فتوحات کے بعد اس قبیلے کے بیشتر افراد اندلس چلے آئے تھے، ان کے والد کا نام ابو بکر غالب بن عطیہ تھا، جو بڑے محدث، فقیہ اور زاہد تھے، انھوں نے اپنے وطن، اندلس کے علماء سے تحصیل علم کے بعد ۴۶۹ھ میں مشرق کا سفر کیا تھا، اور حج و زیارت کے بعد حرمین کے علماء سے بھی استفادہ کیا تھا، اندلس کے ہر حصے میں ان کے شاگرد تھے، (الضبی، بغیۃ الملتمس، ص ۳۷۶، مطبوعہ میڈرڈ، ابن فرحون، الدیباج المذہب، ص ۱۷۵، مطبوعہ قاہرہ)، ابن عطیہ کا خاندان علم و فضل اور

Aldabbi ـه

بزرگی و دینداری میں اندلس میں ممتاز تھا۔

مورخون کا بیان ہے کہ ابن عطیہ ۴۸۱ھ ۱۰۸۸ء غرناطہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کرنے کے بعد اندلس کے اکابر علماء ابو علی صدفی، ابو محمد قیروانی وغیرہم سے تکمیل کی، فراغت کے بعد اندلس کے اکابر علماء کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مزید استفادہ کرتے رہے، علم و فضل، کثرت مطالعہ اور بے نظیر ذہانت و ذکاوت کی بدولت معاصر علماء سے گوئے سبقت لے گئے، علمی شہرت و امتیازی اور حق پسندی کی وجہ سے وہ ایک عرصہ تک المریہ کے قاضی بھی رہے، (نفح الطیب ۳ ۲۸۰ تا ۲۸۲، طبع محمد محی الدین عبد الحمید، قاہرہ)

ابن عطیہ مجاہد عالم تھے، اس زمانے میں اندلس کے مسلمانوں کی عیسائیوں سے جنگیں ہوتی رہتی تھیں، جن میں ابن عطیہ قائدانہ حصہ لیتے تھے، وہ اندلس کے امراء کو خطوط بھیج کر دشمنان دین و وطن کے خلاف جہاد میں شرکت کی ترغیب دیا کرتے تھے، ایک دفعہ وہ عرصۂ دراز تک میدان جہاد میں رہے تو ان کے بوڑھے والد نے جن کی بصارت زائل ہوگئی تھی، یہ شعر لکھ بھیجا

باللہ کن انت لی سمعی وکن بصری	حتی سمعی، وحال القذی فی بصری

(ترجمہ) میری سماعت متاثر ہوگئی، اور میری بینائی میں فرق آگیا، خدا کے لیے اب گھر آکر میرے کان اور میری آنکھیں بن جاؤ۔

ابن عطیہ شعر و سخن سے بھی شغف رکھتے تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں لیکن ان کے ذوق کا اصلی میدان تصنیف و تالیف تھا، انھوں نے اپنے شیوخ کے حالات میں ایک کتاب البرنامج بھی لکھی تھی، جو اب نایاب ہے، لیکن ان کی

بدی شہرت کی ضامن ان کی بے نظیر تفسیر، المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز ہے جس کا سطور ذیل میں تعارف مقصود ہے، انھوں نے لورقہ میں ۵۴۳ھ ۱۱۴۸ء میں وفات پائی۔ (الزرکلی۔ الاعلام، ۴، ۵۳)

علم و فضل علمائے اسلام ابن عطیہ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہے، ابوحیان نے انھیں جلیل القدر مفسر کے نام سے یاد کیا ہے، (البحر المحیط، ص ۹ مطبوعہ قاہرہ)

ابن ضبی نے انھیں مشہور مفسر، فقیہ اور محدث۔ ادیب، نحوی اور بلیغ شاعر کہا ہے (بغیۃ الملتمس ص ۳۷۶، مطبوعہ میڈرڈ)

امام سیوطی نے طبقات المفسرین میں انھیں مقتدائے مفسرین لکھا ہے۔

ان اکابر کے علاوہ امام ابن تیمیہ اور ابن خلدون بھی ان کے بے حد مداح اور معترف ہیں۔

تفسیری ماخذ تفسیر لکھتے وقت ابن عطیہ نے ابن جریر الطبری، النقاش، ابومحمد مکی بن ابی طالب وغیرہم کی تفاسیر کو پیش نظر رکھا ہے،

قرأت کے مباحث کے لیے انھوں نے ابوعلی فارسی کی کتاب الحجۃ اور ابن جنی کی المحتسب سے استفادہ کیا ہے۔

لغت و نحو میں انھوں نے سیبویہ، مبرد، ابوعلی فارسی اور الزجاج وغیرہ کی کتابوں پر اعتماد کیا ہے، وہ ہمیشہ سیبویہ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔

کتب حدیث میں بخاری و مسلم کے علاوہ ترمذی اور نسائی ان کے پیش نظر ہیں۔

فقہ میں وہ الموطا (امام مالکؒ) کے حوالے دیتے ہیں، اس کے علاوہ وہ فقہ مالکی کی امہات کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں، اس کے ساتھ وہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی فقہی

آراء بھی لکھتے جاتے ہیں، لیکن فقہی احکام پر کوئی مناقشہ نہیں کرتے، توحید میں وہ قاضی ابوبکر الباقلانی، امام اشعری اور جوینی وغیرہ کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

اس طرح ابن عطیہ کی تفسیر علوم قراءات، فقہ، احادیث، لغت اور نحو کا بیش بہا خزانہ بن گئی ہے، ابن عطیہ علمائے سابقین کے اقوال بے سوچے سمجھے نقل نہیں کرتے، بلکہ ان پر بے لاگ نقد و تبصرہ بھی کرتے ہیں، یہ تفسیر بڑی حد تک اسرائیلی روایات سے خالی ہے، (کشف الظنون ۱۔ ۲۲۸)

طریقۂ تفسیر ابن عطیہ تفسیر لکھتے وقت قرآنی آیات کی لفظی ترتیب کو مد نظر رکھتے ہیں، کسی آیت کی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے دوسری ہم معنی آیات پیش کرتے ہیں، تائید میں احادیث اور اقوال صحابہ و تابعین لاتے ہیں، وہ زیادہ تر حضرت علی، ابن عباس، عبداللہ بن مسعود، ابن جبیر رضی اللہ عنہم کے تفسیری اقوال پیش کرتے ہیں، قراءات مشہورہ و قراءات شاذہ کو بھی بیان کرتے ہیں،

ابن عطیہ کی دلچسپی اور مہارت کا اصل میدان علوم اللسان (لغت و نحو) رہے، وہ وجوہ اعراب کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں، کیونکہ بقول ان کے اعراب القرآن کے علم پر فہم شریعت کا مدار ہے، ان کی توجیہ کے لیے وہ کلام عرب سے استشہاد لاتے ہیں، مثال کے طور پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر کرتے ہوئے انھوں نے لفظ (بسم) پر بڑی دلنشیں بحث کی ہے، اور بصری اور کوفی علمائے نحو کی تحقیقات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے، مفردات قرآنی کی تشریح کے لیے وہ کلام عرب سے شواہد پیش کرتے ہیں، بسا اوقات وہ ایک لفظ کے کئی کئی معنی لکھ دیتے ہیں، مثلاً لفظ الدین کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ لفظ انسان کی خوش بختی، اعتقادات، عادات، ملکی رسم و رواج، جزا، ذلت و رسوائی، سیاست

حال اور بیماری کے معنوں میں بھی مستعمل ہے، اس کے بعد وہ سیاق و سباق اور موقع و محل کی مناسبت سے مناسب معنی منتخب کر لیتے ہیں، چونکہ ابن عطیہ خود بھی مجاہد عالم تھے، اس لیے آیات جہاد کی تفسیر و تشریح بڑے ذوق و شوق سے کرتے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ یہ جلیل القدر تفسیر قرآن مجید کے بلاغی اور اعجازی پہلوؤں پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی، جو الزمخشری کی تفسیر الکشاف کا خاصہ ہے، لیکن جہاں تک سلاست زبان اور فصاحت بیان کا تعلق ہے، ابن عطیہ کی تفسیر کو تفوق حاصل ہے، کیونکہ الزمخشری متون کی طرح بندھے ٹکے الفاظ استعمال کرتا ہے، اور اس کے پیرایۂ بیان کا اختصار اور ایجاز بھی مخل مطلب ثابت ہوتا ہے۔

تفسیر کے بارے میں علماء کی آراء علمائے اسلام، ابن عطیہ کی تفسیر کی اہمیت، جلالت قدر اور اس کے فوائد کے بے حد قائل ہیں۔

۱- ابو حیان نے لکھا ہے کہ یہ جلیل القدر تفسیر ہے، اور بہت سی تفسیروں پر فوقیت رکھتی ہے، اور الکشاف کے مقابلے میں زیادہ صحیح، زیادہ جامع اور عام فہم ہے (بحر المحیط ج ۱

۲- ابن خلدون نے لکھا ہے: "متاخرین علمائے مغرب میں ابو محمد بن عطیہ کا زمانہ آیا تو انھوں نے تمام تفسیری اقوال پرکھے اور صحیح اقوال کا خلاصہ ایک کتاب میں جمع کر دیا، جو المغرب اور اندلس میں پڑھی پڑھائی جانے لگی۔" (مقدمہ ابن خلدون ص ۹۹۰، مطبوعہ قاہرہ)

۳- امام ابن تیمیہ، ابن عطیہ کی تفسیر کا الکشاف سے مقابلہ و موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، یہ تفسیر الزمخشری کی تفسیر سے برتر، صحیح تر اور مباحث کے اعتبار سے کامل تر اور بہت سی بدعات سے پاک ہے، میں اس کو بہت سی تفسیروں پر ترجیح دیتا ہوں،

(فتاوی ابن تیمیہ، ج ۲، ص ۱۹۴، مطبوعہ قاہرہ)

تفسیر کے اثرات ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی (م ۶۷۱ھ) نے اپنی شہرۂ آفاق تفسیر الجامع لاحکام القرآن میں ابن عطیہ کے نقش قدم کی پیروی کی ہے، صرف احادیث کی تخریج میں زیادہ اہتمام کیا ہے، لیکن اسرائیلیات سے پھر بھی بچ نہ سکے۔

ابو حیان غرناطی نے اپنی تفسیر بحر المحیط میں ابن عطیہ کی تفسیر سے بڑا استفادہ کیا ہے، بلکہ انھوں نے اپنی تفسیر کی بنیاد ہی المحرر الوجیز اور الکشاف پر رکھی ہے، لیکن ساتھ ہی وہ ابن عطیہ کے اقوال پر نقد و جرح بھی کرتے جاتے ہیں۔

شیخ ابو زید عبد الرحمٰن الثعالبی الجزائری (م ۸۷۵ھ) اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور خدا رسیدہ بزرگ تھے، انھوں نے ابن عطیہ کی تفسیر کا اختصار الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن کے نام سے کیا تھا، جو ۱۹۰۹ء میں چار جلدوں میں الجزائر سے شائع ہوا تھا، اب یہ مختصر تفسیر عکسی طباعت میں بیروت سے دوبارہ شائع ہوئی ہے، ضخامت میں جلالین سے دوگنی ہوگی، شیخ ابو زید عبد الرحمٰن نے اختصار کے ساتھ اس میں دوسرے ائمۂ کرام کے تفسیری اقوال و آراء بھی شامل کر دیے ہیں، اس لیے یہ مختصر تفسیر جامع اور بے حد مفید بن گئی ہے، افسوس ہے ابھی تک اس مختصر تفسیر کی کما حقہ خدمت نہیں ہو سکی۔

شمس الدین داؤدی نے طبقات مفسرین میں شیخ عبد الکبیر بن محمد الغافقی المرسی کی ایک تفسیر کا ذکر کیا ہے، جو الزمخشری اور ابن عطیہ کی تفسیروں کی جامع تھی،

ابن عطیہ کی یہ تفسیر (المحرر الوجیز فی تفسیر القرآن العزیز) اب تک غیر مطبوعہ چلی آ رہی تھی، اس کے کامل قلمی نسخے تونس اور مراکش کے شاہی کتب خانوں میں محفوظ تھے، یہ سب قلمی نسخے مغربی رسم الخط میں ہیں، جن کا پڑھنا اہل مشرق کے لیے دقت طلب

بلا محال ہے، چند برس ہوئے کہ مراکش کی وزارت اوقاف نے اس جلیل القدر تفسیر کی طباعت اور اشاعت کا ذمہ لیا تھا، اور بعض اجزاء شائع بھی کر دیئے تھے، جو موجودہ علمی اور تحقیقی معیار سے ناقص تھے۔

خوشی کی بات ہے کہ اب حکومت قطر نے اس کی طباعت کا بیڑا اٹھایا ہے، اور اس کی پہلی جلد خوبصورت ٹائپ میں اعلی سفید کاغذ پر شائع کر دی ہے، جو صرف سورہ بقرہ کو شامل ہے، اس جلد کی تحقیق، تصحیح اور تحشیہ میں چار فضلاء نے حصہ لیا ہے، ان ہی نے احادیث اور شواہد نحویہ کی خوب تخریج کی ہے، اعلام و اماکن اور مشاہیر پر حواشی لکھے ہیں، اور مفسر علام کی عبارت میں جہاں غموض یا ابہام محسوس کیا وہاں حاشیے میں اس کی تشریح کر دی ہے، امید ہے کہ اس تفسیر کی باقی ماندہ جلدیں بھی امیر قطر کی فیاضی سے بہت جلد شائع ہو کر منظر عام پر آجائیں گی۔

تاریخ اندلس

یوں تو اردو میں بکثرت کتابیں اور مضامین ہیں، اور بکثرت دوسری زبانوں کی کتابوں کے ترجمے بھی ہیں، اور پھر وہاں کے مشاہیر کی الگ الگ سوانح عمریاں بھی ہیں خود یہاں سے وہاں کے سب سے زیادہ مشہور اور نامور فلسفی ابن رشد کی نہایت جامع سوانح عمری شائع ہوئی ہے، جس نے اندلس اردو دان طبقہ سے بیگانہ نہیں رہا ہے، یہ دارالمصنفین کے تاریخ اسلام کے سلسلہ کی کتاب ہے، جس میں فاتح اندلس طارق سے لیکر عبد الرحمن اوسط تک اندلس کی سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔

از۔ مولانا سید ریاست علی ندوی۔ قیمت:۔ ۲۹ روپیے

الف لیلۃ و لیلۃ کا ماخذ

از

جناب منظور احمد خانصاحب لیکچرر شعبۂ عربی سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارین لینگویجز، حیدرآباد،

حکایات کے اس عالمی شاہکار کے متعلق جسے عرف عام میں (Arabian Nights) کہا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس کا ماخذ فارسی کہانیوں کا وہ مجموعہ ہے جو ہزار افسانہ کہلاتا ہے، اس کا فارسی مجموعۂ حکایات کو کسی نامعلوم مترجم نے تیسری صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں عربی میں منتقل کر کے "الف لیلۃ و لیلۃ" یعنی "ایک ہزار اور ایک رات" کا نام اس لیے دیا کیونکہ یہ مجموعہ ہزار راتوں میں بٹا ہوا تھا، اور ہر رات ایک کہانی یا اس سے زیادہ کہانی کے ایک حصے پر مشتمل تھی، بعد کے عرب مولفین نے محض ترجمے پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ انھوں نے ان مقررہ راتوں کی تعداد کو قائم رکھتے ہوئے اپنی طرف سے مزید حکایتوں کا اضافہ کیا، یہ اضافے دسویں ہجری (سترہویں صدی عیسوی) تک جاری رہے، جب کتاب کے مختلف نسخوں کی نمود نے راوی اور قصہ گو کو مزید اضافہ سے روک دیا۔

الف لیلۃ کے ماخذ سے متعلق مذکورہ نظریہ مورخین ادب کے درمیان اٹھارہویں صدی عیسوی تک رائج رہا، لیکن جب نامور فرانسیسی مستشرق انطون گالان نے ۱۷۰۴ء سے لیکر ۱۷۱۷ء تک تیرہ سال کی مدت میں الف لیلۃ کا ترجمہ چار جلدوں میں مغربی دنیا کے سامنے رکھا تو دوسرے بے شمار مغربی محققین نے کتاب کے ماخذ اور تاریخ سے متعلق بیش قیمت مقالات

تصنیف کئے، جن میں انھوں چند نئے گوشوں کی طرف واضح اشارے کئے، جن گوشوں کا متقدمین محققین کو گمان بھی نہ گزرا تھا تاہم ہم الف الیلۃ کی اصل کے بارے میں چند اہم آرا کی بحث پر اکتفا کریں گے، کیونکہ ہر ایک محقق کی رائے کو الگ الگ بیان کرنا بہت مشکل ہے، بالخصوص اس وقت جب یہ آرا باہم جزوی اختلاف کی حامل ہوں۔

آسٹریا کا ممتاز مستشرق ودن ہیمر، وہ پہلا محقق ہے، جس نے الف لیلۃ کے ماخذ سے متعلق چند مفید معلومات فراہم کئے، ہیمر نے مسعودی کی مشہور تالیف "مروج الذہب" کے اس نص کی طرف اشارہ کیا جس کی رو سے "الف لیلۃ ولیلۃ" نامی کتاب چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں ہی معروف تھی، اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ منصور یا مامون کے دور میں ہوا تھا، تاہم ہیمر اپنے موقف کو ایک جگہ مسعودی کے اسی نص سے استدلال کرکے بدل دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس کا منصور کے زمانے ہی میں ترجمہ کیا گیا تھا، ہیمر نے ایک لمبی مدت تک بحث و تمحیص میں سرگرداں رہ کر کئی مفید مقالات نشر کئے، اس نے پہلی مرتبہ کتاب کو خطہ ہائے ارضی کے اعتبار سے تین انواع میں تقسیم کیا، پہلی قسم میں وہ کہانیاں آتی ہیں، جو یا تو ہندوستان یا فارس ہی میں لکھی گئی اور جن کی بنیاد خیال اور مبالغہ پر رکھی گئی ہے، دوسری قسم کی کہانیاں جو تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ ہیں، سرزمین عرب میں وجود پائیں، اور یہ اخلاقی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں، تیسری قسم کی کہانیاں مصر میں نشو و نما پائیں، اور یہ ترکی اور مملوکی ادوار کی مصری اجتماعی زندگی کے حالات سے متعلق ہیں۔[۳۴]

ہیمر کی رائے اس وقت ہدف تنقید بن گئی، جب ایک انگلستانی مستشرق ایڈورڈ لین نے یہ نظریہ پیش کیا کہ الف لیلۃ محض ایک شخص کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، لین کے مطابق اسے ۸۸۰ھ سے لیکر ۹۳۲ھ (۱۴۷۵ء، ۱۵۲۵ء) کے درمیان ایک عرب شخص کے ہاتھوں تحریر

کیا گیا، اس طرح سے کتاب میں فارسی یا کسی دوسرے عناصر کے وجود کے بحث کی سرے سے گنجائش ہی نہیں رہتی ہے[۳۵] لیکن اس سلسلے میں کتاب کے موضوعات، اس کی کہانیوں کی طبیعت اور اس کے طرز تدوین سے استنباط کرکے تین دلیلیں پیش کرتے ہیں، پہلی دلیل کی رو سے کتاب مخصوص اجتماعی حالات پر تبصرہ کرتی ہے، جو ایک دوسرے سے گہری موافقت رکھتے ہیں، دوسری دلیل کے مطابق اس مخصوص طرز کے قصے کہانیاں جو الف لیلۃ میں ملتی ہیں، دوسری تمام عربی کتابوں میں ناپید ہیں، اور تیسری دلیل یہ ہے کہ کتاب کے مختلف نسخوں میں جو تنوع ہے اس کے باوجود ان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا ہے، حب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان نسخوں میں پہلے پہلے واضح نقائص موجود تھے، جن کا بعد میں کہیں سے یا تو سننے کے بعد یا کسی اور طریقے سے ازالہ کیا گیا ہے اور یوں مختلف نسخوں کے قصوں کہانیوں کے باہم اس قریبی یکسانیت کی تعلیل کرنا بہت مشکل ہے،[۳۶]

فرانسیسی مستشرق دے ساسی نے لین کے ایک مؤلف کی امکانی تالیف کے نظریے کو کھلے عام رد کر دیا، تاہم اس نے لین سے کتاب کے خالص عربی الاصل ہونے پر اتفاق کیا، دے ساسی اس بات کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "الف الیلۃ" کا ماحول اکثر اوقات میں خالصۃً عربی ماحول معلوم پڑتا ہے، جس میں جن پری، جادو اور جادوگروں سے متعلق باتیں، نیز عربی متھالوجی کی پیدا کردہ باتیں بھی شامل ہیں، دے ساسی کا یہ بھی کہنا ہے کہ انبیاء سے متعلق جو یہودی خرافات ملتے ہیں وہ اہل فارس اور اہل ہند کے درمیان ان ممالک میں اسلام آنے سے پہلے بالکل ناپید تھے، اور یہ کہ الیف لیلۃ میں، ہندوستان اور فارس کی طرف جو اشارے ملتے ہیں، وہ محض قصہ گو کے خیال کی مذکورہ دو ممالک کی نسبت شدید رغبت کی غمازی کرتے ہیں، نیز یہ کہ مسعودی نے "مروج الذہب" میں جس ترجمہ شدہ کتاب کا ذکر کیا ہے، وہ موجودہ الف لیلۃ کے بجائے کوئی دوسری کتاب ہے،

مسعودی کے قول کی نفی ایک اور مستشرق لٹمین نے بھی کی۔ لٹمین القرطبی کے متن کو سامنے رکھتے ہوئے استدلال کرتے ہیں کہ الف لیلۃ ہزار افسانے کا مکمل ترجمہ نہیں ہے کیونکہ یہ کتاب مصر میں تیرہویں صدی عیسوی کے وسط میں مقبول ہوئی، پھر اس میں مسلسل اضافے ہوتے رہے یہاں تک کہ اس نے موجودہ شکل اختیار کی۔ البتہ جہاں تک کتاب کے مقدمے (شہرزاد اور شہریار کے قصے) کا تعلق ہے، تو وہ فی الحقیقت ترجمہ شدہ ہے جب کہ بقیہ کہانیاں خالص عربی الاصل ہیں، کیونکہ ان میں اسلامی روح نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ لٹمین نے موخر الذکر کہانیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا، یوں پہلی قسم کی کہانیاں بغدادی جب کہ دوسری قسم کی کہانیاں مصری کہانیاں کہلائی گئیں۔ بغدادی کہانیاں ہندوستان اور فارس سے درآمد شدہ وہ کہانیاں ہیں جو عباسی دور میں سرزمین عرب میں رواج پائیں اور جو کہانیاں ترک و مملوک کے ایام میں مصر و شام کے ماحول میں پروان چڑھیں، وہ مصری کہانیاں کہلاتی ہیں، تاہم لٹمین بغدادی نسخے کے مصر میں وارد ہونے کی تاریخ کے بارے میں خود تذبذب میں مبتلا ہیں۔[۵۳]

جوں جوں الف لیلۃ کے ماخذ سے متعلق تحقیق آگے بڑھتی رہی، شکوک و شبہات کا ازالہ ہوتا گیا، اور بالآخر ایک ڈنمارک کی مستشرق اوسترو تپ ایک واضح فکرے کر سامنے آیا، اوسترو تپ نے اس سلسلے میں مصر و شام، نیز عراق اور اسکے محاورات میں طویل اقامت اختیار کی، اس نے کتاب کی حکایات کی تقسیم پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ انھیں، تین مختلف طبقوں میں بانٹ کر ان کی ترتیب بھی دی، اور ہر طبقہ کی حکایات کے ماخذ کی بھرپور وضاحت کی، پہلا طبقہ اُن حکایات پر مشتمل ہے، جو ہندوستان اور فارس سے منقول شدہ ہیں۔ اور دوسرا طبقہ بغداد و بصرہ میں وضع کی گئی کہانیوں کا احاطہ کرتا ہے،

جب کہ تیسرا طبقہ ان مصری قصوں پر مشتمل ہے، جو بعد کے ترک و مملوک کے ادوار میں نشو و نما پائے،[۵۴]

تاہم چند محققین ایسے بھی ہیں، جو الف لیلۃ کی حکایات میں بابلی، ترکی اور یونانی عناصر کو ہندی اور فارسی عناصر کے پہلو بہ پہلو پاتے ہیں، ان کے نزدیک مذکورہ لغات کے اسماء اعلام کا وجود ہی الف لیلۃ کے قصوں میں ان عناصر کی دلیل ہے،[۵۵] لیکن ہمارے نزدیک محض اسماء اعلام کا تذکرہ ان قصوں کے متعلقہ ادبیات سے ماخوذ ہونے کی دلیل نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ الف لیلۃ میں اکثر اوقات قصوں کہانیوں کو اس لئے بیرونی شخصیات کی طرف منسوب کیا گیا، تاکہ قاری یا سامع کی توجہ کو مکمل طور مبذول کیا جا سکے۔

الف لیلۃ کے قصوں کو بحیثیت مجموعی چار بڑے طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، (۱) ہندی طبقہ (۲) فارسی طبقہ (۳) بغدادی و بصری عربی طبقہ اور (۴) مصری عربی طبقہ۔ ہندی قصے اہل ہند کے مخصوص معتقدات، ان کی عقل جس کا باریک خیالی مابہ الامتیاز ہے، کی تصویر کشی کرتے ہیں، ہندی معتقدات میں بیوی کی اپنے شوہر سے خیانت سرفہرست ہے، اور یہی وہ اعتقاد ہے جس پہ پوری کتاب کی بنیاد رکھی گئی ہے، باریک خیالی کے نتیجے میں بعض تاجروں کا جنگلی جانوروں کی زبان سمجھنا، بڑے حجم والی مچھلیوں، رخ جیسے بڑے بڑے خیالی پرندوں اور اژدہے وغیرہ کا تذکرہ جیسی عجیب باتیں سامنے آتی ہیں، جہاں تک ہندی طرز کلام کا سوال ہے، تو وہ ایک کہانی کو دوسری کہانی میں ضم کرنے، ایک کو دوسری سے وجود بخشنے اور مندرجہ ذیل جیسی عبارتوں اور سوالات کی تکرار سے ابھرتا ہے، (ولزمك ألا تفعل هذا حتى لا يحصل لك مثل ما حصل لفلان) اور (وكيف كان ذلك؟) ... الخ۔[۵۶]

فارسی قصے ہندی قصوں سے گہری مشابہت رکھتے ہیں، تاہم فارسی اسماء جیسے شہرزاد، شہریار، شاہ زمان وغیرہ اور فارسی تہوار جیسے نیروز، مہرجان ان قصوں کی

فارسیت پر واضح دلالت کرتے ہیں[۸] نیز ان قصوں کا خاصہ یہ ہے کہ یہ کئی کئی ابواب میں اس طرح بٹے ہیں کہ ان کے باہم ربط پیدا کرنے والی کوئی نہ کوئی چیز ضرور موجود ہے اسی لیے ہم شہرزاد کو کتاب کے مقدمے میں سینکڑوں صفحات میں پھیلے قصوں کے درمیاں ربط پیدا کرتے پاتے ہیں،

بغدادی و بصری قصے ان دونوں شہروں کی اجتماعی زندگی اور خصوصاً ہارون رشید کے محل، اور اس میں لہو ولعب، نیز عرب امیروں کے بلند اخلاق کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

مصری قصوں کو دو الگ الگ اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے، پہلی قسم مصری، اور دوسری قسم مصری اسرائیلی کہلائی جاسکتی ہے، مصری اسلامی قصے حقیقت بیانی کی اپنی خاص چھاپ سے جو قاہرہ کی اجتماعی زندگی کے مختلف ادوار میں تصویر کشی پر مبنی ہے، پہچانے جاتے ہیں، اس طرح ان میں صنعت کاروں، تاجروں اور مزدوروں کا بار بار ذکر ملتا ہے، جس بات کا ہمیں ہندی اور فارسی قصوں میں یکسر فقدان نظر آتا ہے، اور جہاں انسان خیالوں کی دنیا میں محو ہو کر بڑی سے بڑی کامیابی کو پلک جھپکنے میں حاصل کر لیتا ہے، مصری اسرائیلی قصے حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کی تقدیس، یہودیوں کی بزرگی کے تذکرے اور ان کے مختلف افادات سے متعلق ہیں، عربی قصے چاہے ان کا تعلق بغداد و بصرہ سے ہو یا مصر سے عربی طرز بیان کی پوری پوری ترجمانی کرتے ہیں، جس کے تئیں ہر قصہ اپنی مستقل حیثیت کا کا حامل ہے[۱۰]

حوالے

۱۔ السباعی بیومی، تاریخ القصۃ والنقد فی الادب العربی، قاہرہ ۱۹۵۶ء ص ۳۲ ۲۔ سہیر القلماوی الف لیلۃ ولیلۃ قاہرہ ۱۹۶۶ء ص ۲۶-۲۰ ۳۔ میخائیل عواد، الف لیلۃ ولیلۃ مرآۃ الحضارۃ المجتمع فی العصر الاسلامی دمشق ۱۹۶۲ء ص ۱۳، ۴۔ سہیر القلماوی، ص ۲۰ ۵۔ فاروق سعد، من وحی الف لیلۃ ولیلۃ، ج ا بیروت ۱۹۶۲ء ص ۳۱-۳۲ ۶۔ میخائیل عواد، ص ۱۲-۱۳ ۷۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مرتب کردہ دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۸۔ احمد حنیف، الف لیلۃ ولیلۃ، یہ مقالہ مشہور مصری رسالے، المقتطف میں مارچ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا ۹۔ میخائیل عواد، ص ۱۴ ۱۰۔ السباعی بیومی ص ۳۵-۳۸۔

معارف کی ڈاک

دہلی
۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء

مکرمی و محترمی جناب سید صباح الدین صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کی مہمان نوازی کا دل سے شکر گزار ہوں، اور صحیح بات تو یہ ہے کہ الفاظ نہیں ہیں میرے پاس کہ واقعی اپنے جذبات کا اظہار کرسکوں، افسوس صرف اس بات کا ہے کہ وقت کی کمی تھی، اور اس خزانۂ علم و آگہی سے جسے دار المصنفین کہا جاتا ہے، پوری طرح فیضیاب نہ ہوسکا، زندگی رہی تو پھر حاضر ہوں گا۔ دعا ہے کہ یہ ادارہ جو ہمارے اسلاف کی یادگار ہے، اور ہمارے لیے ایک بیش بہا ملی اور قومی ورثے کی حیثیت رکھتا ہے، اپنے مشن کو اسی کامیابی سے انجام دیتا رہے جیسا اب تک دیتا رہا ہے، آئیندہ! میں سمجھتا ہوں کہ ادارے کی ایک سالانہ رپورٹ بھی ہر سال چھپنی چاہیے تاکہ ملک کے اندر اور باہر ہمدردوں اور قدردانوں کو آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی سرگرمیوں کا حال معلوم ہوتا رہے کہ ان نامساعد حالات میں بھی آپ حضرات کس طرح اس چراغ کو فروزاں رکھے ہوئے ہیں

ایک بات اور جو پوچھنا بھول گیا کہ کیا دار العلوم دیوبند کی طرح آپ کو بھی سرکاری امداد سے اجتناب کا حکم ہے، اگر نہیں تو پھر سرکار کا فرض ہے کہ وہ آپ کی مدد کرے۔

ذہن میں یہ بھی بات آئی کہ آپ کی منتخب مطبوعات کی تلخیص اگر انگریزی اور ہندی میں شائع ہوتی تو شاید ان کی افادیت اور آپ کی نمایاں کارگذاری میں کافی اضافہ ہوتا، میں سمجھتا ہوں اس کام کے لیے آپ جن کتابوں کو زیادہ مفید سمجھتے ہیں ان کی ایک فہرست ملتی تو پھر حکومت ہند سے کہتا کہ ہندی اور انگریزی ترجمے یا تلخیص اور اشاعت کا ذمہ اٹھائے،

اپنے رفقائے کرام اور اپنے صاحبزادے کو میری طرف سے شکریہ ادا کر دیں، ساتھ ہی اپنے احباب کو جو میری خاطرات گئے تک رکے رہے، اور پھر گفتگو میں حصہ لیا۔

دلی شکریہ کے ساتھ۔ نیازمند سید شہاب الدین۔ (ممبر پارلیمنٹ)

پارو، ضلع مظفرپور
(بہار)
۲۵ ستمبر ۱۹۸۰ء

برادرم - السّلام علیکم

معارف ملا اور آج خط بھی، ہمشیرہ مرحومہ پر آپنے ستمبر ۱۹۸۰ء کے معارف میں جو شذرات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر خوب رویا، آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس کا میں خود شاہد رہا ہوں، بے شک آپ شروع سے آخر تک ان سے جس طرح پیش آئے اور جن جن طریقوں سے آپنے اپنے تعلقات کو نباہا، وہ ایک سعید اولاد سے کم نہیں ہے،

ان کی وفات سے پہلے کے کراچی کے سفر میں جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو وہ برابر آپ ہی کا ذکر کرتی رہیں کہ سید صاحبؒ کے بعد اگر کسی نے دل سے میری ہمدردی کی اور ہر موقع پر میرا ساتھ دیا، تو وہ صباح الدین ہی کی ذات ہے، اللہ تعالےٰ اس کو صحت مند اور بامراد رکھیں، سید صاحبؒ کی وفات کے وقت سلمان سلمہ کمسن تھے، تعلیم پا رہے تھے، مزید تعلیم کے لیے امریکہ چلے گئے۔ وہ جوان اور ملازم ہوتے تو وہ میرا سہارا بنتے ایسے وقت میں صباح الدین کا جو برتاؤ میرے ساتھ دارالمصنفین میں تھا، اس سے کہیں زیادہ کراچی میں رہا، تارا سلمہا کی بہت سی ضرورتیں اور مشکلیں تھیں جو میری خاطر صباح الدین ہی نے پوری اور دور کیں، اور لڑکیوں کے پاس تو مکانات ہیں اور وہ خوش ہیں، البتہ تارا سلمہا کے پاس کوئی مکان نہ تھا، الحمد للہ کہ اب ان کو بھی ایک فلیٹ مل گیا ہے، اب میں اپنی آخری زندگی میں مطمئن اور خوش ہوں۔

جی ہاں، سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم کے انعام کی پچاس ہزار کی رقم ۵۰۰۰۰ ان کے نام سے تین دن قبل پہونچ گئی تھی، یہ ان کے کام تو نہیں آئی لیکن ان کی وصیت کے مطابق یہ رقم تارا سلمہا کی لڑکی کی شادی کے لیے جمع کر دی جائے گی، مجھ کو خود بہت خوشی ہے کہ آپ کی خاموش محبت اور ہمدردی سے

بو بو مرحومہ بہت خوش اور مطمئن تھیں۔

آپ کے شذرات میں مولانا غلام محمد صاحب کا مضمون بھی پڑھا، میں قبرستان سے واپس آ رہا تھا، تو ان کے یہاں بھی چلا گیا، اس وقت وہ یہ مضمون لکھ رہے تھے، مجھ کو پڑھ کر سنایا تھا، مگر ابھی پورا نہ کر سکے تھے، میں نے کراچی لکھا تھا کہ ان کا یہ مضمون جس رسالے یا اخبار میں شائع ہو، اس کی ایک کاپی مجھے بھی بھیج دی جائے، الحمد للہ کہ آپ کے شذرات میں اس کو پڑھ لیا،

ہمشیرہ مرحومہ کی وفات کے وقت بہت ہی المناک بلکہ ناقابل برداشت منظر تھا، جب ان کی روح عالم بالا میں پرواز کر گئی، تو اس کے پندرہ ۱۵ منٹ کے اندر ہی سلمان سلمہ کا فون ڈربن (جنوبی افریقہ) سے آیا، چیخوں اور کہرام کے ساتھ ان کی آواز سنی گئی، سلمان سلمہ کے رونے کی آواز آ رہی تھی، میں نے ٹیلیفون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، تو سلمان ایک دردناک چیخ کے ساتھ صرف اتنا بولے ماموں جان! میں خود بے قابو ہو گیا، صرف اتنا کہہ سکا بیٹے! صبر کرو اور ٹیلیفون کو پاس کھڑے ہوئے عطاء اللہ سلمہ کو دیدیا، شمسیہ سلمہا اور تارا سلمہا تو بے حال ہو رہی تھیں انھوں نے جس محبت، ہمت اور آنسوؤں کے سیلاب کے ساتھ اپنی ماں کو آخری غسل دیا، وہ کبھی نہیں بھولا جا سکتا۔

میں کراچی میں سب کو مغموم، محزون اور پژمردہ چھوڑ کر اپنے وطن پارو چلا آیا ہوں، مگر وہ میری آنکھوں کے سامنے برابر چلتی پھرتی باتیں کرتی اور نمازیں پڑھتی دکھائی دیتی ہیں، اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان ہی کے آنچل کے سایہ میں میری زندگی کا زیادہ تر حصہ گزرا، وہ میری بہن تھیں، لیکن ہر لحظہ ماں بنی رہیں، آج میں اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ جس خوشی سے زندگی بسر کر رہا ہوں یہ سب ان ہی کے مادرانہ طفیل میں ہیں، ان ہی نے میری شادی خانہ آبادی

حضرت سید صاحبؒ کے سایہ شفقت میں کرائی، جو میرے دل کی آواز کہہ رہی ہے کہ ہر طرح سعید اور مبارک ثابت ہوئی۔

آپ کو بھی وہ اپنے بیٹے کے برابر ہی سمجھتی رہیں، آپ کی یہ بڑی کوتاہی ہوگی، اگر آپ نے ان کے اس گھر کو نہیں دیکھا جہاں انکا بچپن گزرا، اور جہاں سے ان کی آیندہ زندگی کا آغاز ہوا، اس لیے میری خواہش ہے کہ آپ زحمت کرکے کم از کم ایک بار پاروآجائیں، پٹنہ سے پارو بس سے دو گھنٹے کا سفر ہے، آپ پٹنہ آجائیں، میرے لڑکے آپ کو یہاں لے آئیں گے، پھر دونوں مل کر ان کی یاد میں اپنے اپنے آنسوؤں کے نذرانے پیش کریں گے، امید کہ آپ میری خواہش کو پورا کریں گے، آپ یہاں آئے تو آپ کے ساتھ دارالمصنفین کی اس ۳۲ سالہ زندگی کو تازہ کرونگا، جو میں نے بوبو اور بھائی جان (یعنی سید صاحبؒ) کے ساتھ وہاں گزاری، وہ زندگی یاد آتی ہے تو بے چین ہوجاتا ہوں، کیسی خوشگوار زندگی تھی، دارالمصنفین اپنی شہرت کے عروج پر تھا، سارے ہندوستان کی توجہ اس کی طرف تھی، کیسے کیسے مشہور لوگ یہاں آتے رہے، اور ان کی آمد سے کیسی کیسی خوشگوار صحبتیں وہاں ہوتی رہیں، خدا کرے اس کی یہ روایت ہر طرح باقی رہے۔

والسلام

سید محمد اسلم

مطبوعات جدیدہ

ارمغان فاروقی } مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و
نذر خواجہ احمد فاروقی } طباعت عمدہ، صفحات ۴۰۰، مجلد مع گرد پوش قیمت ۵۰۰ روپے
پتہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی عزیز الدین وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں دہلی۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی فطری ادیب و انشا پرداز ہیں، خشک اور بے کیف موضوع کو بھی ان کی انشا کی لطافت حلاوت اور دلآویزی اور انداز بیان کی رعنائی و دلکشی اور خوبی شگفتہ تر و تازہ اور پرکیف بنادیتی ہے، انھوں نے شعر و ادب، تنقید و تحقیق اور خاکہ نگاری کے میدان میں اپنے جوہر زیادہ دکھائے ہیں اور ہر جگہ انشائے لطیف اور ادب عالی کا چمنستان آباد کردیا ہے، خواجہ صاحب کی زندگی اردو کے گیسوئے تابدار کو اور تابدار کرنے میں گذری ہے، ان کی سرگرمی اور جد و جہد کے دائرہ میں تحریر و تصنیف ہی کی طرح درس و افادہ بھی شامل تھا، ۱۹۴۷ء کے بعد کے پرآشوب زمانے میں انھوں نے اردو تعلیم کو فروغ دینے کے لیے جو غیر معمولی محنت و ریاضت اور سعی بلیغ کی ہے وہ ان کا زریں کارنامہ ہے، عرصہ دراز تک دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی سربراہی کرکے انھوں نے اس کی عظمت میں چار چاند لگایا ہے، وہی اس شعبہ کے بانی بھی تھے، انھوں نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا، ایک میں تعلیم و تدریس کا ایسا بہتر نظام قائم کیا کہ اردو سے بیزار طلبہ بھی اس کی تحصیل کیلئے مجبور ہوگئے، اور دوسرے شعبہ کو تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کا مرکز بنایا، اور بہت سی نادر و نایاب محققانہ کتابیں شائع کیں اور اردوئے معلیٰ کے نام سے ایک معیاری رسالہ جاری کیا

جس کے کئی بلند پایہ خاص نمبر نکلے، ۱۹۸۳ء میں خواجہ صاحب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو شعبۂ اردو کے کارگذاروں نے اپنے بانی و محسن اور اردو کے اس بے لوث خدمت گزار کی علمی و تعلیمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک مجلہ ان کو نذر کرنے کا فیصلہ کیا جو اب شائع ہوا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں خواجہ صاحب کی شخصیت و کمالات پر مضامین درج ہیں اور دوسرا حصہ مفید علمی، ادبی اور تحقیقی مقالات پر مشتمل ہے، پہلے حصہ کی ابتدا خواجہ صاحب کے خود نوشت حالات "عمر رائگاں" سے کی گئی ہے، اس میں پہلے اپنے وطن اور خاندان کے بارہ میں گوناگوں مفید معلومات جمع کر دئے ہیں، اس سے اُس علمی و تعلیمی ماحول کا پتہ چلتا ہے جس میں انکی نشو و نما ہوئی تھی پھر اپنی تعلیم اور عمر رفتہ کی سرگذشت تحریر کی ہے، اس میں ان کے کئی اساتذہ احباب اور دوسری علمی و ادبی شخصیتوں کا تذکرہ بھی آگیا ہے، اس کے بعد اپنی تحریری و تصنیفی سرگرمیوں کی کچھ روداد سنائی ہے اور آخر میں دلی یونیورسٹی سے اپنی وابستگی اور شعبۂ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے اپنی کارگذاری کی تفصیل قلمبند کی ہے، ایسی مشغول، سرگرم عمل، بکار آمد اور مفید علمی و ادبی خدمات کے لیے وقف رہنے والی زندگی کو خواجہ صاحب بھلے ہی سے عمر رائگاں کیوں نہ کہیں مگر دوسروں کے نزدیک تو یہ وہ عمر جاوداں ہے، جس میں ان کے لیے بہت کچھ درس و پیام ہے، اسی لیے غالباً اس کو علحدہ بھی شایع کیا گیا ہے، دوسرا مضمون پروفیسر خلیق احمد نظامی کا ہے، جن کے بقول ان کی اور خواجہ صاحب کی زندگی اس قدر ہم آہنگ اور مشترک و متحد ہے کہ "من و تو" کا فرق ہی مٹ گیا ہے، انھوں نے خواجہ صاحب کے بعض مضامین کا تجزیہ و تحلیل کر کے ان کے کمالات کی مصوری کی ہے، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور سید ضمیر حسن دہلوی کو بھی خواجہ صاحب کے قریب رہکر ان کی زندگی اور شخصیت سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے، اس لیے دونوں کے

لے پتہ۔ گلستاں پبلشنگ ہاؤس سرسید روڈ۔ علی گڑھ۔

مضامین اچھے ہیں، بیگم فریدہ وقار نے خواجہ صاحب کی کتاب "یاد یار مہرباں" کی روشنی میں ان کی خاکہ نگاری میں مہارت دکھائی ہے، ڈاکٹر مغیث الدین فریدی نے ان کے علمی و ادبی مضامین کے مجموعہ "چراغ رہگذر" پر بحث و گفتگو کی ہے، اس حصہ میں بعض شعرا کا منظوم خراج عقیدت اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، اور ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی کے خطوط بھی درج ہیں، ان کے علاوہ خواجہ صاحب کی سرگرم اور مشغول زندگی کے گذشتہ کارناموں کا ایک نقشہ بھی دیا گیا ہے،

دوسرے حصہ کی ابتدا پروفیسر گیان چند کے عالمانہ مضمون "دلی اور لکھنؤ کی زبان کا معرکہ" سے کی گئی ہے، اس میں دونوں جگہوں کے جس معرکہ کا ذکر ہے وہ "باغ و بہار" اور "فسانۂ عجائب" کے ارد گرد محدود ہے، لیکن آخر میں جوش ملیح آبادی اور شاہد احمد دہلوی کے معرکے کا ذکر بھی آگیا ہے، مگر وہ بھی بقول مضمون نگار، امن و تمردرہی کے قضیے کی توسیع ہے، مولانا فضل حق خیرآبادی پر ایوب قادری مرحوم کا مضمون بھی پر از معلومات ہے، اس میں مختلف ریاستوں میں مولانا کے قیام، ملازمت اور سرگرمیوں کی تفصیل دی گئی ہے، سوانحی مضامین میں خواجہ محمد ہاشم کشمی (پروفیسر غلام مصطفیٰ) بھی تحقیقی حیثیت سے بلند پایہ ہے، اکمل ایوبی صاحب نے دکھایا ہے کہ علامہ اقبال مشہور ترکی مفکر ضیا گوک الپ کے افکار و خیالات سے واقف تھے، اور انھوں نے اپنے خطبات میں اس کی چند نظموں کی تخلیص بھی کی ہے، مگر دونوں کے طرز فکر بہت مختلف تھے۔ پروفیسر ہادی حسن کی انگریزی تصنیف "ایرانی بحریہ کی تاریخ" کا ڈاکٹر کبیر احمد جائسی نے جائزہ لیا ہے، ادبی مضامین میں "اردو خمسے" (شہاب جعفری) فکر اقبال کے جدید پہلو (ڈاکٹر وقار احمد رضوی)، اصغر کی شاعری کا عروضی تجزیہ (عنوان چشتی) اور رشید حسن خاں کے مضامین بہتر ہیں، اس طرح یہ یادگاری مجلہ باوقار مضامین پر مشتمل اور خواجہ صاحب کے شایان شان ہے، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے اسکو بڑے سلیقہ سے مرتب کیا ہے، دلی کے یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے اسکو نفاست سے شائع کر کے ایک

اچھی مثال قائم کی ہے۔

شرح مثنوی جلد یکم و دوم :۔ تالیف شاہ داعی الی اللہ شیرازی تصحیح و پیش گفتار محمد نذیر رانجھا صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات جلد یکم ۱۱۳، وجلد دوم ۶۰۰ مجلد قیمت ہر جلد /۹۰ روپے۔ پتہ مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان، اسلام آباد، پاکستان۔

مولانا رومؒ کی مثنوی دنیا کی مقبول ترین کتابوں میں ہے، فارسی زبان میں نظم و نثر کی جسقدر کتابیں لکھی گئی ہیں، کسی میں ایسے دقیق، نازک اور عظیم الشان مسائل اور اسرار نہیں مل سکتے جو مثنوی میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، اسی بناپر اصحاب علم وفن نے مثنوی کی طرف تمام کتابوں کی نسبت زیادہ توجہ کی، اور اس کی بے شمار شرحیں لکھی گئیں جن کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، پیش نظر کتاب بھی مثنوی کی اوسط درجہ کی شرح ہے، اس کو محمود شاہ داعی الی اللہ حسینی شیرازی نے نویں صدی ہجری میں مرتب کیا تھا، گو اس میں اکثر اہم مباحث و مسائل سے تعرض نہیں کیا گیا ہے اور اکثر اشعار کی شرح و توضیح بھی نہیں کی گئی ہے تاہم اپنی قدامت اور بعض دوسری خصوصیات کی وجہ سے یہ اہمیت سے خالی نہیں ہے، اس لئے مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان نے اس کو اہتمام سے شائع کیا ہے، شرح کی تصحیح و مقابلہ کا کام جناب محمد نذیر رانجھا صاحب نے سلیقہ سے انجام دیا ہے، پہلی جلد مثنوی کے دفتر اول و دوم کی شرح پر مشتمل ہے، اور دوسری جلد میں مثنوی کے تیسرے چوتھے پانچویں اور چھٹے دفتر کے اشعار کی شرح کی گئی ہے، پہلی جلد کے شروع میں نذیر رانجھا صاحب کا ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں فارسی، عربی، ترکی، اردو، پنجابی، سندھی، پشتو، کشمیری اور انگریزی زبان میں جو شرحیں لکھی گئی ہیں، ان سب کی فہرست دی ہے، جن کی تعداد ۱۹۵ ہے، رانجھا صاحب نے زیر نظر شرح کے چار قلمی نسخوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک نسخہ کتابخانہ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی

ایران وپاکستان کا ہے، اسی کو اس متن کی بنیاد بنایا گیا ہے، دونوں جلدوں کے آخر میں قرآنی آیات، احادیث نبوی، اقوال مشائخ اور فارسی وعربی اشعار کی تخریج کی گئی ہے، اور اشخاص، کتب اور اماکن کا اشاریہ بھی دیا ہے، مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان نے فارسی کی بلندپایہ اور نایاب کتابوں کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا ہے یہ اسی کی ایک کڑی ہے۔

نسایم گلشن (شرح گلشن راز) :۔ تالیف شاہ داعی الی اللہ شیرازی، تصحیح و پیش گفتار محمد نذیر رانجھا صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۸۳ مجلد قیمت ۵۰ روپے پتہ مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان، اسلام آباد پاکستان۔

یہ کتاب بھی شاہ داعی اللہ شیرازی کی تالیف ہے جو تصوف کی مشہور ومقبول اور اہم منظوم کتاب گلشن راز کی شرح ہے، گلشن راز محمود شبستری کی تصنیف اور تصوف کے گوناگوں اسرار و نکات پر مشتمل ہے، اسی لئے شاہ داعی الی اللہ نے اس کی شرح لکھی، گویہ شرح زیادہ مبسوط نہیں ہے تاہم مرکز تحقیقات نے فارسی کے قدیم لٹریچر اور معیاری کتابوں کی اشاعت کا جو پروگرام بنایا ہے، اس کو بھی اسی کے ماتحت شائع کیا گیا ہے، اس کی ترتیب، تصحیح اور مقابلہ کا کام بھی نذیر رانجھا صاحب نے حسن و خوبی سے انجام دیا ہے، شروع میں ان کے قلم سے ایک مقدمہ ہے، اس میں شاہ داعی اللہ کا مختصر حال ان کی تصنیفات اور اس شرح کے متعلق بعض معلومات تحریر کئے ہیں آخر میں آیات واحادیث اور اقوال واشعار کی تخریج کی ہے، اور اشخاص وکتب اور جگہوں کے ناموں کا اشاریہ دیا ہے۔

رسول اکرم ﷺ اور یہود حجاز :۔ مرتبہ ڈاکٹر برکات احمد و مترجمہ ڈاکٹر مشیر الحق، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲۰۸، مجلد قیمت ۴۰ روپے، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں حجاز میں جو قومیں آباد تھیں ان میں یہودی قوم سب سے ممتاز اور نمایاں تھی، اور اس کی آبادی بھی زیادہ تھی، آپؐ جب ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس کے نواح میں مختلف یہودی قبائل آباد تھے، مگر اس دور کے یہودیوں کے سیاسی و تمدنی حالات کا ذکر کم ملتا ہے اور جو ملتا ہے، اس میں رطب و یابس ہر طرح کا مواد شامل ہے، اس کی وجہ سے معاندین اسلام خصوصاً مستشرقین کو آپ کی ذات پر طعن و تشنیع کرنے کا موقع ملا، اس کتاب میں دور رسالت کے یہودیوں کے بارے میں چھ ابواب میں معلومات پیش کئے گئے ہیں، پہلے باب میں ہجرت کے زمانہ کے یہودیوں کے حالات بیان کئے ہیں، دوسرے باب میں یہود مدینہ سے آپؐ کے معاہدہ کا ذکر ہے، تیسرے باب میں مسلمانوں کے خلاف یہود و منافقین کی سازش کا تذکرہ ہے، اس میں بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ کے واقعات تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں، چوتھے اور پانچویں باب میں علی الترتیب غزوہ احزاب اور غزوۂ خیبر پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، آخری باب میں یہود کی شکست اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح و کامرانی کے اسباب کا جائزہ لیا گیا ہے، شروع میں مصنف کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں اسلام اور یہودیت پر مغربی علما کی متعدد کتابوں کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے مسلمان مصنفین سیرت کے اصول تاریخ کو نظر انداز کرنے کی شکایت کی ہے، مصنف نے اپنے ماخذ کی نشاندہی کرتے ہوئے قرآن مجید کو اپنا اولین ماخذ بنایا ہے، پھر اپنے دوسرے ماخذ ابن اسحاق، واقدی اور ابن سعد وغیرہ کی کتابوں کا ذکر کرکے ان کا اس حیثیت سے ناقدانہ جائزہ لیا ہے کہ یہ اپنے عہد و ماحول کے اثرات سے خالی نہیں ہیں، ان کے خیال میں ان حضرات کا تاریخی شعور بہت سارے دوسرے عوامل سے متاثر تھا، اس لیے رسول اکرمؐ کے زمانے کے یہودیوں سے آپ کے تعلقات کے سلسلہ میں انھوں نے جو معلومات تحریر کئے ہیں ان کا جائزہ لیتے وقت خلافت عباسیہ میں رہنے والے ان کے ہم عصر

یہودیوں کی زندگی کو بھی مد نظر رکھنے کی ضرورت ہے، لایق مصنف نے ان اسباب کا بھی ذکر کیا ہے، جن کی وجہ سے آج ہمیں واقعات کی کڑیاں ملانے اور جوڑنے میں دشواری پیش آرہی ہے، مصنف نے سیرت نبوی کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے، اور وہ فلسفۂ تاریخ و تنقید کے قدیم اصول اور تصنیف کے جدید انداز سے بھی واقف ہیں اس لئے انھوں نے یہ کتاب غور و فکر سے اور سلجھے ہوئے انداز میں لکھی ہے معروضیت کی وجہ سے اس میں عقیدت و جذباتیت کا کوئی رنگ نہیں آنے پایا ہے، مگر وہ خود مغربی طرز فکر سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے بعض نتائج اطمینان بخش نہیں ہیں، کہیں کہیں ان کے خیالات میں الجھاؤ اور تضاد بھی معلوم ہوتا ہے، مثلاً آپؐ کے اور یہود مدینہ کے درمیان معاہدہ کا ذکر اثبات و نفی دونوں میں ہے، (ص ۶۶ و ۷۰) اسی طرح بنو قریظہ کے واقعہ کی توجیہہ گنجلک ہے، احادیث کے متعلق بھی ان کا ذہن زیادہ صاف نہیں ہے، بعض خامیوں کے باوجود یہ ایک سنجیدہ کتاب ہے، جس کو ڈاکٹر منیر الحق نے اردو میں منتقل کیا ہے، ان کا نام ہی ترجمہ کی خوبی و روانی کا ضامن ہے۔

رسمِ جنوں: ۔ مرتبہ جناب الحاج حافظ محمد دیوان صاحب، تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۱۸ قیمت تحریر نہیں، پتہ بریلی فورڈ روڈ لندن ایس ڈبلیو ۲، انگلینڈ۔

جناب حافظ محمود دیوان کی ابتدائی زندگی بمبئی میں گذری، سیر و سیاحت کا شوق انھیں مختلف ملکوں میں لے گیا، اب لندن میں مقیم ہیں، وہاں اردو کے شیدائیوں نے ۱۹۶۰ء میں اردو کی خدمت کے لیے الہلال ارگنائزیشن قائم کیا ہے، اس کی جانب سے ماہنامہ الہلال بھی نکلتا ہے، اس ارگنائزیشن سے دیوان صاحب کا بھی تعلق ہے، ان کو شعر و سخن کا فطری ذوق اور آرزو لکھنوی کے شاگرد ہیں، لندن میں بھی ان کی مشق سخن کا سلسلہ جاری ہے، اور وہاں کے

ان کے کئی مجموعے چھپے ہیں، یہ مجموعہ نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے، ان کا کلام نشیب و فراز کے مختلف مرحلوں سے گزرتا رہا ہے، تاہم وہ کیفیت اور تازگی سے خالی نہیں ہے یہ مجموعہ مختلف ملکوں کی سیر و سیاحت کے تجربات، زندگی کے مشاہدات اور اخلاق و حکمت کے درس پر مشتمل ہے، دیوآن صاحب مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں، اس مجموعہ میں بعض بہت مشکل زمینوں میں انھوں نے اچھے شعر نکالے ہیں، لندن میں اردو کا پرچم بلند کرنے پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، وہاں سے ایک ضخیم مجموعہ کا اتنا خوبصورت شائع ہونا اردو کی مقبولیت کا ثبوت اور اس کا اعجاز ہے۔

کتاب نامہ شبلی :- مرتبہ جناب اختر راہی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر صفحات ۴۰، قیمت ۴ روپے، پتہ مسلم اکیڈمی، محمد نگر، علامہ اقبال روڈ، لاہور ۱۵۔

یہ کتاب مولانا شبلیؒ کی تصنیفات و مقالات کے علاوہ ان پر لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اشاریہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں تین اجزا ہیں ایک میں مولانا کی مرتب کردہ اردو، فارسی اور عربی تصانیف کا ذکر ہے، دوسرے جز میں ان کے تلامذہ یا دوسرے لوگوں نے ان کی جن کتابوں اور مضامین کو شائع کیا ہے ان کی فہرست دی ہے، تیسرے میں ان کی جن کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں کئے گئے یا جن کی تلخیص کی گئی ان کا انڈکس درج ہے، دوسرے حصہ میں پہلے مولانا پر تحریر کی گئی کتب پھر ان پر لکھے جانے والے مضامین کا تذکرہ ہے، سب سے آخر میں مولانا شبلیؒ پر انگریزی کتابوں اور مضامین کی فہرست دی گئی ہے، ہر حصہ میں کتابوں کے سنہ اشاعت، ان کے صفحات کی تعداد اور مطبع کا نام بھی تحریر ہے، اور مضامین جن رسالوں یا اخباروں میں شائع ہوئے ہیں، ان کے نام ماہ و سنہ کی صراحت سے درج ہیں، اس سے پہلے مولانا شبلیؒ کے بعض اشاریے مرتب کئے گئے ہیں، جو عموماً رسالوں میں چھپے تھے، یہ اشاریہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے، اور غالباً سب سے بہتر ہے، شروع میں حافظ نذر احمد صاحب پرنسپل شبلی کالج لاہور کا ایک مختصر دیباچہ بھی ہے جس میں مولانا شبلی کی عظمت و جامعیت بیان کی ہے، اس میں غلطی سے ایک جگہ دار المصنفین کا نام ندوۃ المصنفین لکھ گیا ہے، جو تعجب انگیز ہے۔

جلد ۱۴۰ ماہ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۶ء عدد ۵

مضامین

مقالات